علمی تحقیقی ادبی فکروں کا بیباک ترجمان

ماہنامہ

الماس

ممبئی

مدیر: مفتی شرف الدین عظیم قاسمی الاعظمی

معاون مدیر: مولانا حفظ الرحمن اعظمی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

علمی، ادبی اور تحقیقی فکروں کا ترجمان

ماہنامہ الماس ممبئی

جلد نمبر: ۱ | شوال ۱۴۴۲ھ مطابق جون ۲۰۲۱ء | شمارہ نمبر: ۱

سرپرست

مولانا شفیق احمد قاسمی امام وخطیب عرب امارات

مدیر تحریر: مفتی شرف الدین الاعظمی

معاون مدیر: مولانا حفظ الرحمن الاعظمی

مجلس مشاورت

مفتی ارشد صاحب شیروانی، مولانا ولی اللہ مجید قاسمی، مولانا ضیاء الحق خیرآبادی، منظر خیامی، مولانا مفتی ذیشان قاسمی، عامل صدیقی

کمپوزنگ: خورشید احمد الاعظمی

مجلس ادارت

مولانا محمد عرفات اعظمی، مفتی شکیل منصور قاسمی، مفتی رضوان قاسمی، مفتی عبید اللہ شمیم اعظمی، مولانا قمر الحسن مہراج گنج، مولانا سرفراز قاسمی، مولانا سالم سریانوی، مولانا عبداللہ اعظمی

ناشر: ادارہ علم وادب انوار مسجد شواجی نگر گوونڈی ممبئی

اس شمارے میں

اپنی بات

بقلم: ایڈیٹر

رسائل وجرائد اپنے دور اپنے عہد کے نمائندے ہوتے ہیں، ذرائع ابلاغ کے اس مؤثر وسیلے نے ہر زمانے میں جہاں علوم ومعارف، تحقیق وتدوین، تاریخ وترتیب، اور افکار ونظریات کی ترویج واشاعت کا تاریخی کارنامہ انجام دیا ہے، وہیں زبان وادب کی تعمیر وترقی اور اس کی زلف برہم کو سنوارنے میں بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔

اقوام وملل کے سماجی، سیاسی، اخلاقی، فکری علمی، تمدنی، ثقافتی اور نظریاتی جہانوں میں تغیرات وانقلابات کی تیز ہواؤں کے ذریعے ان میں وسعت وترقی اور تعمیراتی وتہذیبی عمل میں ان رسالوں اور جریدوں کا کلیدی کردار رہا ہے، مذہب کے حوالے سے بھی ان ذرائع ابلاغ نے انسانوں کو انسانیت کی شاہراہ سے آشنا کیا، زندگی کی حقیقتوں اور اس کے عظیم مقاصد کا شعور بخشا، بلند اخلاق وکردار کی روشنی عطا کی، مادہ پرستی کی تاریکیوں سے نکال کر روحانیت کا سرمایہ عطا کیا۔

رسالوں کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ یہ متنوع الجہات اور متنوع الافکار ہوتے ہیں، اس میں مختلف قلم کاروں، نثر نگاروں کے ہفت رنگ خیالات پر مشتمل تنوعاتی جہانوں کے جلوے نظر آتے ہیں، اس میں تحقیقات کے دشت بھی ہوتے اور تاریخ کے دریچے بھی، ادب وانشاء کی خوبصورت وادیاں بھی ہوتی ہیں، اور معلومات کے جزیرے بھی، دینی علوم ومعارف کی تنویریں بھی دل کی دنیا میں اجالا کرتی ہیں اور صحت مند وپاکیزہ کردار وعمل کی متحرک تصویروں کا شہر نگاراں بھی قلب وروح میں تازگی پیدا کرتا ہے۔

برصغیر میں اُردو رسالوں کی کثیر تعداد ایک دور میں منظرِ عام پر آتی اور علوم وفنون کی تاریخ رقم کرتی رہی، آزادی کے بعد اس ملک کی فضا بدلی، ماحول بدلا، مزاج بدلے، ذوق وطبیعت میں تغیر رونما ہوا، اردو زبان وادب سے دلچسپی کم ہوئی، فاتح اقوام کی زبان کی طرف بے تحاشا ہجرتوں نے اُردو رسالوں کے گلشن میں ویرانیت پیدا کردی، نتیجے میں بے شمار گراں مایہ اور تاریخ ساز جریدوں نے دم توڑ دیا، تاہم مایوسیوں کے اس عہد میں بھی اسلامی اداروں کی توجہات نے دینی وعلمی ترجمانوں کے اجراء کے ذریعے اس کائنات کی آبرو باقی رکھی۔

موجودہ دور میں جب کہ شوشل میڈیا نے دنیا کے فاصلوں کو سمیٹ کر ایک بستی میں تبدیل کردیا ہے افکار ونظریات کی ترسیل ماضی کے مقابلے میں نہایت آسان ہوگئی ہے، آسانیوں کے پیشِ نظر برقی اخبارات ورسائل میں بھی تعداد کے لحاظ سے خاصا اضافہ ہوا ہے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان رسالوں کی اکثریت زبان وبیان اور علم وادب کے معیار سے تشویشناک حد تک گری ہوئی ہے، وقت کا تقاضا تھا کہ کوئی ایسی میگزین منظر عام پر آئے، جو علم وتحقیق، زبان وادب کے ساتھ ساتھ اسلامی تعلیمات کا سرمایہ قوم کو دے سکے۔

مایوسیوں کے اندھیرے جب گہرے ہوتے ہیں، یاس وناامیدی کے گہرے بادل جب ہر سو پھیل کر دل ودماغ میں خوف وہراس پیدا کردیتے ہیں، تو اس وقت احساسات کی آواز بلند ہوتی ہے اور حالی کی زبان میں گویا ہوتی ہے کہ" "ہم کچھ کرنہیں سکتے، یا ہمیں کچھ کرنا چاہیے،، پہلی سوچ کی حامل زندگیاں ہمیشہ کے لیے گمنامی کی غذا بن جاتی ہیں، دوسرا نظریہ انقلاب لاتا

ہے، وقت کے سینے پر تاریخ رقم کرتا ہے، عزم و ہمت کا نقش قائم کرتا ہے، اور پھر فلک رسا منزلوں کو بھی عبور کر لیتا ہے۔

یہ رسالہ جو آپ کی نگاہوں کے سامنے ہے اس کی بنیاد پر ہم یہ دعویٰ تو نہیں کر سکتے ہیں کہ فکری کائنات میں اس کے ذریعے تاریخی کارناموں کی دنیا یقینی طور پر آباد ہوگی، لیکن اتنی بات ضرور کہی جا سکتی ہے کہ مذکورہ فکر و نظر کے چراغوں کو روشن کرنے کی جدوجہد عین ممکن ہے کہ اپنے ہدف کو پالے، اور یہ رسالہ میل کا پتھر نہیں تو کم از کم تاریک راتوں میں معمولی قندیل ثابت ہو جائے، اگر ایسا ہوا تو ہم اپنے مقصد میں یقیناً کامیاب ہوں گے۔

آئینہ ایام

نائب مدیر

دارالعلوم کا یوم تاسیس اور اکابر کا عمل

کسی شئی کی افادیت اگر یوم تاسیس، یوم پیدائش وغیرہ کی تقریب کا جواز عطا کرتی تو یقینا حضرت نانوتوی سے لیکر دور حاضر کے علماء تک ہر ایک بارہ ربیع الاول کو" عید میلاد النبی" کی تقریب منعقد کرتا، خود بھی شریک ہوتا اوروں کو بھی ترغیب دلاتا، کیونکہ اس ارض گیتی پر نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات سے بڑھ کر کوئی ہستی نہیں جس کا فیضان کائنات کے ذرے ذرے کو محیط ہو۔

ایسا نہیں ہے کہ 30 مئی تاریخ انسانی میں صرف دو ہی بار آئی، ایک اس وقت جب انار کے نیچے میخانۂ علم وعرفاں کی بنیاد رکھی گئی، دوسرے اس وقت جب اس میخانے کے قدح خواروں میں شعور وآگہی کا نور جگمگایا اور انھوں نے زمانے کے قدم سے قدم ملا کر چلنا سیکھ لیا، 30 مئی کی تاریخ سینکڑوں بار آئی، گئی مگر علماء دیوبند نے کبھی بھی یوم تاسیس کے عنوان سے کوئی تقریب منعقد نہیں۔

غیروں کی تقلید میں دارالعلوم دیوبند کی یوم تاسیس کا شور مچانے والے فضلاء کیا اپنے اکابر کو بھی نہیں دیکھتے کہ تغیرات نے لاکھ رنگ وروپ بدلے، ایجاد ودریافت کی ایک وسیع دنیا نگاہوں کے سامنے آئی، زمانے کے طور طریقے بدلتی ہوئی ہواؤں کے دوش پر سوار ہوئے، دنیا نے نشست وبرخاست سے لے کر بود وباش تک کی ہزاروں سمتیں متعارف کرائیں مگر یہ ان کے اکابر کا حوصلہ تھا کہ انھوں نے کہ ہر اس چیز کو پاؤں کی ٹھوکر پر رکھا جو نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم سے میل نہیں کھاتی تھی۔

اس لئے دیو بند کی نسل نو اگر اپنا نہیں تو کم از کم عشق و مستی کے اس قافلے کی عظمت کا خیال رکھے جن کے نزدیک زمانے سے متاثر ہوئے بغیر ما جاء بہ الرسول کی پاسداری ہی مقصد حیات ہے۔

کر بلبل و طاؤس کی تقلید سے توبہ
بلبل فقط آواز ہے طاؤس فقط رنگ

مغرب کی غلامی کا اثر

چند سکوں میں خریدی ہوئی کنیزوں اور ان کی سوچ کا کیا؟ ان کے پیش نظر تو ہمیشہ آقا کی خوشنودی ہی ہوا کرتی ہے، اس لئے مغربی دنیا کی کوئی کنیز اگر یہ بیان دیدے کہ" لوگ شادی کیوں کرتے ہیں؟ پارٹنر بن کر زندگی گزاریں"۔ تو اس پر تعجب کیسا؟؟ سارا عالم جانتا ہے کہ یہ بے چاری تو حق نمک ادا کر رہی ہے، اپنے آقاؤں کے احسان کے بوجھ کو ہلکا کرنے کی کوشش کر رہی ہے اور مادیت کی جس رنگین دنیا نے اس کی آنکھوں کو خیرہ اور دل کو سیاہ کر رکھا ہے اس کی ترجمانی کا فریضہ انجام دے رہی ہے۔

بات اس مغرب کی ہونی چاہئے جس نے تہذیب و تمدن کے سارے نقوش مٹا ڈالے، شرم و حیا کی عبائیں قبائیں اتار پھینکیں، اور ترقی کے نام پر، مساوات کے نام پر پوری نسل کو مادیت کے ایسے دلدل میں ڈھکیل دیا جہاں زندہ رہنے کے اخلاقی قدروں کو پامال کرنا شرط اول سمجھا جاتا ہو، روشن خیالی اور آزادی کے نام پر عریانیت و فحاشیت کا وہ دریچہ کھولا جس کی مسموم ہواؤں نے صنف نازک کی عزت و ناموس کو جھلسا کر رکھ دیا، مغرب نے رشتوں ناطوں کے

بندھن کو توڑ کر جس طرح عورت کو ہر مرد کے لئے تسکین کا ایک سامان اور ان کے ہاتھوں کا کھلونا بنادیا ہے اس کی مثال ماضی کے ان بھیانک ادوار میں بھی نہیں ملتی جہاں عورت ہونا ہی عورت کا سب سے بڑا گناہ تھا۔

ایسا نہیں ہے کہ مغرب کی اخلاقی پستی خصوصا صنف نازک کی حالت زار کا ادراک صرف مشرقی اقدار کے حامل افراد ہی کو ہے بلکہ خود مغرب کے سنجیدہ و باہوش مفکرین اس پر اپنی تشویش کا اظہار کرتے رہتے ہیں، اوران کی یہ تشویش کنیزوں کے لئے پیغام ہے کہ تم جس ہوش ربا جنت کی تشہیر وتبلیغ کر رہی ہو وہ ترقی کی معراج نہیں بلکہ اخلاقی پستی کی انتہا ہے۔

شگاف زدہ چادر کی پیوند کاری

پچھلے پانچ سالوں میں تعمیر وترقی کا کوئی بھی قابل ذکر کام نہ ہونے کے باوجود حکمراں طبقے کو اپنے رویوں اپنی پالیسیوں اور اپنے مسلم مخالف نظریات کی بنیاد پر یقین کامل تھا کہ ریاست اتر پردیش کی زمام اقتدار ایک بار پھر انھیں کے ہاتھوں میں آئے گی، اور ملک وملت کی بدلتی ہوئی فضاء صاف طور پر اس امکان کی تصدیق بھی کررہی تھی۔۔مگر برا ہو عالمی وبا کا جس نے امید وبیم کی ساری دیواریں منہدم کر کے انھیں خدشات کی ایک نئی دنیا سے روشناس کرادیا۔

حکمراں طبقے کی بدقسمتی یہ کہ ریاست کے لوگوں نے بالخصوص اکثریتی طبقے نے ابھی ابھی موت کا رقص اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، دریاؤں میں تیرتی بے گور وکفن لاشیں، گنگا کنارے خاک آلود پڑے مردار جسم، شمشان گھاٹ پر کھڑے بے بس ولاچار لوگ، شفاء خانوں میں مچا ہواہاہا کار، اوران سب سے بڑھ کر ریاست کے والی وحاکم کی بے حسی وبے غیرتی

نے اکثریتی طبقے کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے، اور کچھ بعید نہیں کہ ان کے غیض وغضب کا شعلہ انتخاب میں طوفان کی شکل اختیار کر جائے۔

اس لئے ان سلگتے ہوئے موضوعات سے ذہن بھٹکانے اور شگاف زدہ چادر میں پیوند کاری کے لئے ایک بار پھر ہندو مسلم اور مندر مسجد کا کھیل ضروری ہو گیا تھا اور اس کی تیاری بھی شروع ہو چکی ہے، چنانچہ جہاں ایک طرف وزارت داخلہ نے غیر مسلم پناہ گزینوں کی شہریت کا معاملہ اٹھا کر ماحول کو حساس بنانے کی کوشش کر رہا ہے تو وہیں دوسری طرف ایک رکن پارلیمان نے اپنے ٹیوٹر ہینڈل سے "رام مندر" کے تعمیراتی کاموں کی تشہیر کے ذریعے برادران وطن کے جذبات سے کھیلنے کی کوشش کی ہے، اور ریاست کے وزیر اعلی کے کہنے ہی کیا، گورکھناتھ مندر کے قرب وجوار میں صدیوں سے آباد مسلمانوں سے جبرا جگہ خالی کرانے کا نوٹس دیکر برادران وطن کا دل جیتنے میں مشغول ہیں۔

مدارس کا تحفظ قوم کی ذمہ داری

مدارس عربیہ جنھیں برصغیر میں اسلام کا سب سے معتبر حوالہ مانا جاتا تھا اور جن کے خون جگر سے شجر اسلام کی آبیاری کی جاتی تھی، افسوس آج وہ مدارس جانکنی کے عالم میں آخری سانس لے رہے ہیں، حالات کے سفاک پنجوں نے انھیں لاغر وکمزور اور مختلف اندیشہ ہائے خیال نے ان کے چہرے کی رعنائی چھین لی ہے۔

طویل مدتی پابندیوں نے یوں تو زندگی کے ہر شعبے کو متاثر کیا ہے، کیا تعلیم کیا کاروبار؟ ہر شئی پر حسرت ویاس کی بدلی چھائی ہوئی ہے، ایک انجانا خوف ہر شخص کو پریشان کر رہا ہے، لیکن

مدارس اسلامیہ کی حالت ان میں سب سے زیادہ دگرگوں اور پریشان کن ہے، تعلیمی سلسلے کے انقطاع سے لیکر وسائل کی فراہمی تک ہر شئی خدشات کے بھنور میں ہچکولے کھارہی ہے، ایک طرف طلبۂ عزیز جو تعلیم کی راہ نہ نکل پانے کی وجہ سے حصول معاش کے ذرائع تلاش کررہے ہیں تو دوسری طرف مخلص اساتذہ بھی عائلی مجبوریوں کے آگے سرنگوں ہوکر تعلیم و تعلم جیسے مقدس پیشے کو خیر باد کہنے پر مجبور ہیں، رہ گئے ارباب حل وعقد تو ان کے پاس اپنی بے بسی کا مرثیہ پڑھنے کے علاوہ کوئی انتظام نہیں ہے، کیونکہ زکوۃ وصدقات ---جو مدارس کی آمدنی کا واحد ذریعہ سمجھے جاتے ہیں---ان کا حصول پچھلے دو مرتبہ سے پابندیوں کی نذر ہورہا ہے۔

مدارس پر قہر وغضب بن کر ٹوٹنے والے ان حالات کا اگر جلد تدارک نہ کیا گیا تو آنے والا وقت ملت اسلامیۂ ہند کے لئے قیامت صغری سے کم نہیں ہوگا اس لئے اب ارباب جنوں کے بیدار ہونے، مدارس کی نصرت وامداد کو ملت کے تمام کاز پر ترجیح دینے اور روایتوں کی صفیں توڑ کر آگے بڑھنے کا وقت آگیا ہے بایں معنی کہ زکوۃ وصدقات سے اوپر اٹھ کر اب لوگ مدارس کی امداد، راس المال کے ذریعے بھی سرانجام دیں، اور ہر شخص اپنے امکان کی وسعتوں تک مدارس کی امداد کو لازم وضروری سمجھ لے۔

اسلام میں خوشبو کی اہمیت

مفتی شرف الدین عظیم قاسمی
امام وخطیب مسجد انوار شیواجی نگر گوونڈی ممبئی

انسان فطری طور پر جمال پسند ہے، اس کی فطرت ہر اس چیز کی طرف بے ساختہ مائل ہوتی ہے جو اپنی ذات کے لحاظ سے دل آویز، خوبصورت، اور حسن وجمال سے آراستہ ہوتی ہے، ان جمالیاتی اشیاء کے باعث زندگی فرحت وشادمانی اور سرور انبساط کی کیفیت سے آشنا ہوتی ہے۔

زمین پر بکھرے ہوئے خوبصورت مناظر، گلشنوں میں صبح دم بادصبا کی مست خرامی، لالہ وگل کی مستی، شاخ گل کی انگڑائی اور بلبلوں کے بے خود کردینے والے نغمے اور اس کے اثرات سے مخمور چمن زاروں کا جہان صدرنگ جب نگاہوں کے سامنے آتا ہے تو دل کی وادیوں میں بے ساختہ نشاط کی لہر دوڑ جاتی ہے، وجود میں اہتزاز کی کیفیت پیدا ہوتی ہے، طبیعت میں سرشاری اور تازگی کا احساس پیدا ہوتا ہے، ٹھیک اسی طرح قوت شامہ جب کسی عمدہ قسم کی بو کا سامنا کرتی ہے، تو فطری طور پر وجود میں فرحت، وتازگی اور چستی ونشاط کا احساس ہوتا ہے۔

خوشبو کی یہ خاصیت ہے کہ وہ ذہن کو بیدار کرتی ہے، طبیعت میں سرشاری لاتی ہے، اضمحلال اور سستی کو دور کرتی ہے، جسم کو قوت عمل پہونچاتی ہے، عزم جواں پر مشتمل توانائی عطا کرتی ہے روح کو سکون اور قلب کو فرحت عطا کرتی ہے، عمدہ عطر اور نفیس خوشبو تفکرات سے انسان کو آزاد کرتی ہے، زندگی میں جاذبیت اور چہرے میں دلکشی پیدا کرتی ہے، اس کا استعمال

فطرت کا تقاضا اور نفیس ذوق کی آواز اور علامت ہے، یہی وجہ ہے کہ اسلام میں اس کی بہت اہمیت ہے، فرشتوں کی جماعت خوشبوؤں کے شہر یعنی چمن زاروں کو پسند اور بدبو کی تعفن زدہ فضا سے نفرت کرتی ہے، زادالمعاد کے مطابق فرشتوں کی محبوب ترین چیز خوشبو ہے جسے شیطان ناپسند کرتا ہے اور شیاطین کی پسندیدہ چیز بدبو ہے۔ (زادالمعاد ج،4)

محسن کائنات فخر دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم اطہر سے خوشبوؤں کی لہریں پھوٹتی رہتی تھیں، جس راہ سے آپ کا گذر ہوجاتا وہ راستہ مہک اٹھتا، جس گلی میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قدم پڑ جاتے وہ مشکبار ہوجاتی، آپ کے پسینے کی مہک اس قدر جاں نواز تھی کہ اس کی وجہ سے دل کی وادی ہی نہیں بلکہ وجود کی کائنات معطر معطر ہوجاتی، حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جسم مبارک سے مشک وعنبر کی خوشبو آیا کرتی تھی، ام سلیم رضی اللہ عنہا کا یہ عمل تو مشہور ہے کہ انھوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پسینے کو ایک شیشی میں جمع کرلیا تھا اور اسی کو اپنی عطر میں تھوڑا ملا کر استعمال کرتی تھیں اس پسینے کی وجہ سے وہ عطر مشک وغیرہ سے بھی بڑھ جایا کرتی تھی، اس کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عمدہ عطریات کا استعمال فرماتے، خوشبو آپ کی پسندیدہ چیزوں میں سے ایک تھی۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے دنیا میں عورتیں یعنی بیویاں، اور خوشبو پسند ہے اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے (سنن نسائی حدیث نمبر 3392) حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ایک سیاہ چادر مانگی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کو استعمال کیا مگر جب اس میں پسینہ لگا اور اون کی بو محسوس ہوئی تو اس کو اتار دیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو خوشبو بہت پسند تھی (ابوداؤد کتاب اللباس)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خوشبو خود بھی استعمال کرتے تھے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مشک اور عود کی

عطر زیادہ پسند تھی اور عموماً اسی خوشبو کا آپ استعمال بھی کرتے تھے، حضرت انس رضی اللہ عنہ کی شہادت ہے آپ ﷺ کے جسم اطہر سے مشک وعنبر کی خوشبو پھوٹتی رہتی تھی، اور خوشبو لگانے کی تاکید وتلقین بھی آپ ﷺ کرتے تھے، اس کی بڑی وجہ اسلام کی انسانیت نوازی اور دوسروں کو ضرر رساں اور اذیت رساں چیزوں سے محفوظ رکھنے کا مزاج ہے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی اسی مزاج کا آئینہ تھی کہ۔

تمام عمر اسی احتیاط میں گذری
کہ آشیاں کسی شاخ چمن پہ بار نہ ہو

اور یہ امر مشاہداتی ہے کہ اجتماعی مراحل میں اکثر نہیں بلکہ لازماً موسم گرما وغیرہ میں پسینے کی بو قریب والوں کے لیے اذیت کا باعث ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ آپ نے لہسن پیاز یا اس طرح کی دوسری سبزیوں کو ناپسند کیا ہے کہ ان کے کھانے کے بعد منھ سے بو آتی ہے اور اسی بنیاد پر آپ ﷺ نے خاص اجتماعیت کے مواقع پر مثلا عیدین، جمعات کے وقت خوشبو لگانے کی ہدایات دی اس کی تاکید فرمائی اس کے استعمال کی ترغیب دی چنانچہ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص جمعہ کے دن غسل کرے، اور خوب اچھی طرح سے طہارت حاصل کرے، تیل استعمال کرے، اور جو خوشبو اس کو میسر ہو لگائے پھر نماز جمعہ کے لئے نکلے، اور مسجد میں پہونچ کر دو آدمیوں کے درمیان نہ گھسے، نوافل پڑھے، سکون سے خطبہ سنے، تو آنے والے جمعہ تک تمام گناہ معاف ہوجاتے ہیں (بخاری: باب الطیب للجمعہ)

خوشبو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس قدر پسند تھی کہ اگر کوئی آپ ﷺ کو عطر ہدیہ کرتا تو کبھی اسے واپس نہیں کرتے تھے اور اسی کی تلقین بھی کرتے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی شہادت کے مطابق عطر کا ہدیہ کبھی آپ ﷺ نے واپس نہیں کیا (بخاری وترمذی)

عطر اور خوشبو فطرت اور نیچر کا تقاضا ہے، اسی وجہ سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں کثرت سے یہ شامل ہے اور اسی بنیاد پر اسلامی معاشرے کا یہ اہم حصہ ہے، اسلامی عیدین اور جمعہ کے علاوہ دوسری دینی وثقافتی مجلسوں، خانقاہوں اور درسگاہوں میں بھی ان کے ذریعے فضاؤں کو معطر رکھا جاتا ہے، مساجد میں عود اور بخور کی دھونی دی جاتی ہے، رمضان المبارک کے مہینے میں تو اس کا اہتمام بہت بڑھ جاتا ہے، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی زندگیوں میں اس کا بہت اہتمام ملتا ہے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ عطر کا اتنا استعمال کرتے تھے کہ جس گلی سے گذرتے وہ اپنی مہک اور خوشبو کی وجہ سے گواہ ہوتی کہ۔ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے۔

تاریخی اعتبار سے خوشبو کی دریافت چار صدی قبل مسیح میں ہوئی ہے، جہاں للّی کے پھولوں کو کشید کر کے استعمال کیا گیا، یونان کی قدیم تہذیب میں بھی خوشبو تک رسائی کے آثار ملتے ہیں، دسویں صدی میں مشہور مسلم سائنس داں بوعلی سینا نے پھولوں کو نئے طریقے سے کشید کر کے عطر بنانے کا فن دریافت کیا، اگر انصاف سے دیکھا جائے تو ہر چند عطر کی دریافت یونانیوں اور رومیوں نے کی مگر سائنٹیفک اور فنی طور پر اسے وجود میں لانے، دنیا میں متعارف کرانے، اسے پروان چڑھانے اور سماج وعام زندگی کا حصہ بنانے میں اسلامی تمدن کا اساسی کردار ہے، ورنہ تو قدیم عہد میں مشک وعنبر کی خوشبو دریافت اگرچہ تھی، مگر کارخانوں اور فیکٹریوں میں ملکی پیمانے پر اس کی صنعت کا تصور نہیں تھا اس لیے یہ گرانی کے باعث عوام کی پہونچ سے باہر تھی، اس کا وجود قصرہائے سلطنت اور امراء ووزرا کی حویلیوں کی دیواروں میں محصور تھا، بوعلی سینا کے پھولوں اور پھلوں کے ذریعے عطر سازی کی دریافت کے بعد اس کی

صنعت بڑے پیمانے پر پھیلی اب تو اس صنعت کو اتنی مقبولیت حاصل ہے کہ ملک میں اکثر مقامات پر اسکے کارخانے موجود ہیں، ہاں یہ ضرور ہے کہ خالص عطر اب بھی نہایت گراں ہے، جو مشک وعنبر اور عود سے تیار ہوتی ہے۔حاصل یہ کہ عطریات اور خوشبوئیں اسلامی معاشرے کا اہم حصہ ہیں،اس سماج کی یہ شناخت ہیں،خوبصورت پہچان ہیں، یہ امر مسلم ہے کہ اس کا ذوق صرف مسلم معاشرے اور خاص طور سے عرب میں ہی پایا جاتا ہے دوسری اقوام خصوصا برادران وطن اس سرمایہ سے قطعاً ناآشنا ہیں اسی وجہ سے ان کے یہاں ان چیزوں کی طرف میلان یا رجحان بھی نہیں پایا جاتا ہے، یہ امتیاز صرف اسلام اور اہل اسلام ہی کو حاصل ہے کہ روح کی غذا بننے والی اشیاء کی انہیں معلومات بھی ہے اوران کی زندگی کا لازمی اور تمدنی حصہ بھی۔

مولانا حبیب الرحمان اعظمی سے تین ملاقات

مولانا محمد عرفات اعجاز اعظمی

مولانا حبیب الرحمان اعظمی جگدیش پوری کے نام سے بچپن ہی سے کان مانوس ہے مگر ان کے کام سے واقفیت اس وقت ہوئی جب ذہن شعور کی حدود میں داخل ہوا۔ ان کی سب سے پہلی کتاب 'تذکرہ علمائے اعظم گڑھ' مطالعہ میں آئی اور اس نے اقبال سہیل کے اس مصرع کی تصدیق کر دی:

جو ذرہ یہاں سے اٹھتا ہے وہ نیر اعظم ہوتا ہے

مولانا کی پہلی شعوری زیارت ۲۰۱۱ء میں ہوئی جب میں دارالعلوم دیوبند داخلہ امتحان کے لیے حاضر ہوا تھا۔ اعظمی منزل کے سامنے مسجد رشید کے صحن میں بیٹھا ہوا تھا، سامنے اعظمی منزل کی پہلی منزل پر ایک بزرگ صورت محوِ خرام نظر آئے۔ گورا نورانی سراپا، داڑھی اور سر کے بال سفید براق، ہونٹوں پر پان لاکھا، ہشاش بشاش چہرہ، تنومند جسم، نہ گرانڈیل اور نہ ہی بہت دبلے پتلے۔ چہرے کی سنجیدگی اور متانت بتا رہی تھی کہ کسی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ ایک ساتھی نے تعارف کرایا کہ 'یہ مولانا حبیب الرحمان اعظمی ہیں'۔ یہ سن کر آنکھیں پھیل گئیں، بے ساختہ زبان سے نکلا 'تذکرہ علمائے اعظم گڑھ والے؟' جواب ملا 'ہاں، وہی'۔ محسوس ہوا کہ آنکھوں کی برسوں پرانی تشنگی کو اب سیرابی ملی ہے۔ مولانا سے علمی عقیدت پرانی تھی، اس لیے فطری طور پر یہ خواہش پیدا ہوئی کہ مولانا سے استفادے کی کوئی صورت ہو جاتی تو اچھا ہوتا۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ داخلے کے بعد ان سے براہ راست استفادے کا سر و سامان فراہم ہو گیا۔ یعنی

میرا نام ہفتم ثالثہ میں آیا جس میں مولانا مشکوۃ شریف کے آخری حصے کا درس دیتے تھے۔ ہفتم کے سال میں سب سے زیادہ دل چسپی مولانا ہی کے درس سے رہی۔ مولانا کی زبان میں رکاوٹ تھی، بہت سلاست اور تیزی کے ساتھ نہیں بولتے تھے، ٹھہر ٹھہر کر اطمینان سے بولتے تھے اور زبان کی رکاوٹ واضح طور سے محسوس ہوتی تھی، مگر جب بولتے تو علم کے موتی رولتے۔ حدیث کی تشریح اور اس کے متعلقات پر پوری بصیرت کے ساتھ گفتگو کرتے اور گفتگو میں حوالوں کا اہتمام جتنا ان کے یہاں دیکھا، دوسروں کے یہاں یہ چیز کم کم نظر آئی۔ ایک خاص چیز ان کے یہاں یہ دیکھی کہ حدیث کی تشریح میں حتی الامکان اردو کے وہ الفاظ استعمال کرنے کوشش کرتے جو حدیث کے الفاظ کا من وعن ترجمان ہو یا پھر اس سے قریب تر ہو۔ وہ اس سلسلے میں لفظ کی غرابت یا تہذیب کے قائل نہیں تھے۔ عموماً دیکھا کہ کسی پیچیدہ لفظ کی تشریح میں کوئی مناسب لفظ نہیں مل سکا تو اعظم گڑھ کی علاقائی زبان کا سہارا لیا یا دیوبند اور اس کے اطراف میں اس کے لیے جو لفظ استعمال ہوتا ہے، اسے برتا۔ ظاہر سی بات ہے کہ علاقائی الفاظ زیادہ تر طلبہ کے لیے نامانوس ہوتے، ایسے مواقع پر عموماً درس گاہ کی عجیب صورت حال ہوجاتی، جس علاقے کا لفظ مولانا استعمال کرتے اس علاقے کے طلبہ بخوبی سمجھ لیتے مگر دوسرے طلبہ ٹک ٹک دیدم کی تصویر بن جاتے۔

دورہ حدیث شریف میں مولانا سے ابوداؤد شریف پڑھنے کا شرف حاصل ہوا۔ ایک مرتبہ حد زنا سے متعلق ایک حدیث کی تشریح میں مولانا نے ایک ایسا لفظ استعمال کیا جو عموماً اردو تہذیب میں نامناسب سمجھا جاتا ہے اور اس ایک لفظ کے مفہوم کو طویل فقرے میں بیان کرنا علمائے فن و ادب گوارا کرتے ہیں۔ چوں کہ مولانا 'حد' کے معاملے کی تنقیح کررہے تھے اور شریعت کا یہ اصول ہے کہ حدود کا ثبوت صریح لفظ سے ہوتا ہے جس میں کسی اور معنی کا امکان نہ ہو، اس لیے مولانا نے بھی اس کی تشریح میں لفظوں کی تہذیب اور قلوب واذہان کی شائستگی کو بالائے

طاق رکھتے ہوئے اردو کا وہی لفظ استعمال کیا جو عمل زنا کے معنی میں صریح ہے۔ اس لفظ کا زبان سے ادا ہونا تھا کہ پوری درس گاہ میں سناٹا چھا گیا، ہر شخص پھٹی آنکھوں سے مولانا کی طرف دیکھنے لگا کہ یہ کیا بول دیا انھوں نے! مگر مولانا نے اس کی طرف سرے سے التفات نہیں کیا اور بغیر کسی تغیر وتکدر کے اپنی تشریحی گفتگو جاری رکھی۔

مولانا کی یہ لفظی جرأت بعض متصوف طلبہ کو کھَلی بھی جس پر ان لوگوں نے درس گاہ کے بعد ناپسندیدگی کا اظہار کیا، مگر عام طور سے طلبہ مطمئن تھے کہ ایسے مواقع پر استعارے اور کنائے سے بوجھل گفتگو سے بہتر ہے کہ ایک لفظ میں پوری بحث کو سمیٹ دیا جائے۔ مولانا علمی و گوشہ نشین آدمی تھے، ان کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ اپنے پاس طلبہ کی بھیڑ بھاڑ کو پسند نہیں کرتے ہیں، درس گاہ کے علاوہ اوقات میں وہ زیادہ تر علمی مشاغل یعنی مطالعہ یا لکھنے میں مصروف رہتے تھے۔ طلبہ کی آمد و رفت دیگر اساتذہ کے بہ نسبت ان کے یہاں بہت کم رہتی تھی، عموماً طلبہ ان کے یہاں جانے سے گھبراتے تھے اور خود مولانا کا یہ قول برحق تھا کہ 'طلبہ کو اتنا موقع کہاں سے ملتا ہے کہ وہ اِدھر اُدھر سیر سپاٹے یا کسی کے ہاں حاضر باشی کا فریضہ انجام دیتے رہتے ہیں، مجھے تو کبھی اتنی فرصت نہیں ملتی کہ درس گاہ، مطالعے اور روزمرہ کے کاموں کے سوا کچھ کر سکوں۔

دارالعلوم دیوبند کی دو سالہ طالب علمی میں تین مرتبہ بالمشافہ مولانا سے ملاقات کا موقع ملا اور ان تینوں ملاقات کی تقریب مولانا کی کتاب تذکرہ علمائے اعظم گڑھ کا دوسرا ایڈیشن بنا۔ ۲۰۱۱ء میں بقرعید کی تعطیل سے قبل ایک روز والد صاحب کا فون آیا کہ 'کسی وقت جا کر مولانا حبیب الرحمان اعظمی صاحب سے مل لینا، وہ کچھ کاغذات دیں گے، اسے لے لینا۔' تعمیل حکم میں مولانا خدمت میں حاضر ہوا۔ دروازے سے داخل ہوتے ہی دیکھا کہ سامنے ایک چوڑا سا تختہ بچھا ہوا ہے اور اس کے بغل میں پلنگ پر مولانا لیٹے ہوئے ہیں اور حسب معمول ہاتھ میں ایک کتاب ہے جسے

الٹ پلٹ کر دیکھ رہے ہیں۔ سلام کیا تو چونکے اور میری طرف ایسے دیکھا جیسے کوئی ناگہانی پیش آ گئی ہو، شاید یہ ان کے لیے ناگہانی ہی رہی ہو، کیوں کہ جس وقت میں گیا تھا اُس وقت عموماً ان کے پاس کوئی جاتا نہیں تھا اور نہ اس وقت کسی کے آنے کو وہ پسند کرتے تھے۔ مصافحہ کیا اور اپنا تعارف کرایا تو ایسا محسوس ہوا کہ خوش ہو گئے، فوراً بٹھایا اور خود بھی اٹھ کر بیٹھ گئے اور خاص اعظم گڑھ کی زبان میں کہا کہ 'تمھارے ابا تو میرے دوست ہیں، تم جب داخلہ کے لیے آئے تھے تبھی آ کر ملنا چاہیے تھا۔ کل تمھارے ابا سے بات ہوئی تب مجھے معلوم ہوا کہ تم اس سال یہاں ہفتم میں داخل ہوئے ہو' میں خاموش ان کی بات سنتا رہا اور ہوں ہاں سے زیادہ کچھ کہنے کی جرأت نہیں کر سکا۔ تھوڑی دیر کے بعد مولانا اٹھے، کمرے میں گئے اور کاغذات کا ایک پلندہ ہاتھ میں پکڑے ہوئے باہر نکلے۔ کچھ دیر اسے الٹتے پلٹتے رہے، کچھ کاغدات الگ کیے، اس کے بعد میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا کہ 'گھر جاتے ہوئے یہ لیتے جانا، تذکرہ علماے اعظم گڑھ کا دوسرا ایڈیشن شایع کرنے کا ارادہ ہے، تمھارے ابا سے اس پر لکھنے کے لیے کہا ہے، وہ لکھ دیں گے تو بقرعید کے بعد آتے ہوئے لیتے آنا' میں نے 'اچھا' کہا اور مصافحہ کر کے چلا آیا۔

بقرعید کے بعد دارالعلوم پہنچا تو دوسرے دن کاغذات لے کر مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا۔ دیکھتے ہی خوش ہو گئے، بڑی گرم جوشی کے ساتھ مصافحہ سے نوازا، کچھ دیر باتیں کیں اور اس تاکید کے ساتھ رخصت کیا کہ 'کبھی کبھار سر راہے یا یہاں آ کر ملاقات کرتے رہنا، تاکہ یاد تازہ رہے۔' یہ مولانا سے دوسری ملاقات تھی۔

تیسری ملاقات تذکرہ علماے اعظم گڑھ کے طبع ہونے کے بعد ہوئی۔ ازراہِ تذکرہ دوستوں میں ایک دن یہ بات آئی کہ 'مولانا کی کتاب تذکرہ علماے اعظم گڑھ پریس سے آ گئی ہے۔' یہ مژدہ سن کر اس کے حصول کا شوق جاگا، کتب خانوں کی خاک چھاننی شروع کی گئی، مگر ہر

جگہ سے ایک ہی جواب ملا کہ 'ابھی نہیں آئی ہے۔' خبر دینے والے نے بڑے وثوق سے خبر دی تھی کہ 'کتاب پریس سے آ گئی ہے، میں نے خود دیکھا ہے۔' بالآخر کتب خانوں کی خاک پھانکتے ایک ایسے کتب خانے پر پہنچے جس کے مالک اتفاق سے اعظمی تھے۔ انھوں نے عقدہ کھولا کہ 'کتاب تو بے شک آ گئی ہے مگر مولانا نے فروخت کے لیے ابھی کتب خانے والوں کو دیا نہیں ہے۔' اب تلاش ہوئی کسی ایسے شخص کی جو قیمتاً مولانا کے یہاں سے کتاب حاصل کر سکے۔ ایک اعظمی طالب علم نے یقین دلایا کہ وہ یہ کام کر دے گا اور ان صاحب نے پیشگی اس کی قیمت بھی لے لی، لیکن دن مہینے میں تبدیل ہو گیا مگر وہ صاحب نہ کتاب لا سکے اور نہ قیمت واپس کی۔

جب ہر سمت سے مایوسی ہاتھ لگی تو پھر ہمت کر کے خود جانا طے کیا اور ایک دن ڈرتے ڈرتے مولانا کے کمرے میں جا دھمکا۔ دیکھتے ہی پہچان لیا، مسکرائے، بٹھایا، کچھ دیر اِدھر اُدھر کی بات کی اور پھر آنے کے غرض پوچھی۔ عرض کیا 'تذکرہ علما اعظم گڑھ چاہیے۔' اعظم گڑھی لہجے میں کہا کہ 'کتاب چھپنے کے بعد میں نے تمھارے ابا کے پاس پچیس نسخے بھیج دیے ہیں، ان کا فون آیا تھا، وہ ان تک پہنچ گئی ہے۔ گھر جانا تو اسی میں سے لے لینا۔' عرض کیا 'گھر جانے میں ابھی بہت وقت ہے، قریب ایک مہینے اِدھر اُدھر ہاتھ پاؤں مارنے کے بعد یہ آخری قدم اٹھایا ہے۔' سن کر مسکرائے، اٹھ کر کمرے میں گئے اور دو نسخے لے کر آئے اور کہا کہ 'اس میں ایک اچھا ہے، وہ تمھارے لیے ہے اور دوسرے میں طباعت کی کچھ خامیاں ہیں یعنی کچھ صفحات آگے پیچھے ہو گئے ہیں، وہ اپنے دوستوں میں سے کسی کو دے دینا۔' کتاب ہاتھ میں لی، سر آنکھوں سے لگایا اور الٹے پاؤں کمرے کی طرف بھاگا۔ ……………………………………

حصول علم اور اس کے تقاضے

ڈاکٹر سمیہ بن ریاض فلاحی
آراضی باغ اعظم گڑھ

ابتدائے آفرینش سے ہی حصول علم کی اہمیت مسلم ہے، چنانچہ قرآنی فرمان اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ انسانیت نے اپنے سفر کا آغاز جہالت کی تاریکی سے نہیں بلکہ علم کی روشنی سے کیا ہے۔ تخلیق آدم کے بعد رب کائنات نے انسان اول کو سب سے پہلے جس چیز سے سرفراز کیا وہ اشیاء کا علم تھا۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:" وعلم آدم الأسماء کلھا "(البقرۃ:31) اور اس نے آدم کو تمام اشیاء کے نام سکھائے۔ یہ وہ علم اشیاء ہی ہے جس کی بنا پر انسان کو تمام مخلوقات پر برتری حاصل ہوئی۔

اور دین اسلام میں تعلیم کی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں لہذا اسلام کا آغاز ہی لفظ""" اقرأ" سے ہوا جس سے دین اسلام کو وہ منفرد مقام حاصل ہوا کہ وہ سراپا علم بن کر تعلیمی دنیا میں ایک ہمہ گیر انقلاب کا پیامبر ثابت ہوا۔ تعلیم اور علم انسانی زندگی میں ایک روشن چراغ کی مانند ہیں جن کی روشنی میں ہی انسان صحیح راہ کا انتخاب کرسکتا ہے ورنہ جہالت کا گھٹا ٹوپ اندھیرا انسان کو کفر و ضلالت کے اس بھیانک گڑھے کی بھینٹ چڑھا تا ہے جہاں سے اس کا نکلنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن نظر آتا ہے۔ لہذا علم کی اسی فضیلت کے پیش نظر نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بذات خود منبع علم وفیض بن کر انسانیت کو راہ مستقیم دکھائی اور فرمایا:" انما بعثت معلما"(ابن ماجہ:229) میں تو صرف معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ اور لوگوں کو علم کے حصول کی ترغیب دی اور علم کے اثرات کو

واضح کرتے ہوئے علم اور اہل علم کو معزز ٹھہرایا اور علم سے پہلوتہی کے نقصانات سے آگاہ کیا۔

انسانی زندگی مختلف ترقیاتی مراحل سے گھری ہوئی ہے لہذا انسان کی معاشی ترقی ہو یا اقتصادی، فکری ترقی ہو یا علمی، حصول علم سے مبرّا نہیں۔ چنانچہ علم چاہے دینی ہو یا دنیوی بہرحال انسانی اقدار کو پروان چڑھانے کے لئے ضروری ہے۔ لہذا فرمان نبوی ہے:"" طلب العلم فریضة علی کل مسلم و مسلمة" ("ابن ماجہ والطبرانی:224) ''علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے'' یہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ دین کے بنیادی علوم خواہ وہ عقائد و نظریات سے متعلق ہوں یا ارکان اسلام سے، معاشرتی اقدار سے متعلق ہوں یا معاشی و اقتصادی معاملات سے، شخصی عبادات سے متعلق ہوں یا دعوت اِلی اللہ و الدین سے، ان کا حصول بہرکیف ہر مسلمان پر فرض ہے، کیونکہ کسی بھی معاملے میں علم نہ ہونے کی صورت میں انسان اندھی تقلید پر مجبور ہوتا ہے جو بسا اوقات شرک و بدعات پر مبنی ہوتی ہیں۔

اسلامی نقطہ نظر سے اگرچہ دینی علوم کو فوقیت دی گئی اور بندے کا دینی تعلیم حاصل کرنا اللہ کا انتخاب مانا جاتا ہے جیسا کہ فرمان نبوی ہے " من یرد اللہ به خیرا یفقهه فی الدین "" (البخاری:71 ومسلم: 1037) اللہ جس کے ساتھ خیر کا ارادہ کرتا ہے اسے دین کی سمجھ بوجھ عطا کرتا ہے، اور علم دین کی فضیلت اس ایک مبارک جملے سے جوڑ دی گئی ہے "خیر کم من تعلم القرآن وعلمہ" (البخاری) ''تم میں بہتر وہ ہے جو قرآن کو سیکھے اور سکھائے'' مگر اس کے ساتھ ہی دیگر عصری علوم سے مستفید ہونے کی بھی ترغیب ملتی ہے چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ان الفاظ میں دعا مانگنا " اللهم انفعني بما علمتني و علمني ما ينفعني و زدني علما"(ترمذی) ''اے اللہ مجھے جو علم دیا ہے اس سے نفع پہنچا اور مجھے وہ علم دے جو میرے لئے نفع بخش ہو اور میرے علم میں اضافہ فرما'' اور اللہ تعالیٰ کا فرمان " ربنا اتنا فی الدنیا حسنة و فی الآخرة حسنة "(البقرة:

201)’’اے ہمارے رب ہمیں دنیا و آخرت میں بھلائی عطا فرما‘‘ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اللہ کو صرف اخروی زندگی ہی نہیں بلکہ دنیوی زندگی بھی مقصود ہے۔

اس لئے ہر وہ علم جو عالم انسانیت کے لئے نفع بخش ہو اس کے حصول میں کوئی قباحت نہیں بلکہ بعض دفعہ ضروری ہو جاتا ہے۔ دنیوی علم کے حصول کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ ہمارے جد امجد حضرت آدم علیہ السلام کو سب سے پہلے اشیاء کا ہی علم دیا گیا اور آج سائنس کے سارے شعبے اشیاء کے علم سے ہی متعلق ہیں۔ اسی طرح نفع بخش اطلاقی سائنس اور صنعت و حرفت کے علم کے حصول کا جواز بھی ثابت ہے۔

چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام کا کشتی بنانے اور داؤد علیہ السلام کو زرہ بنانے کا علم عطا کیا جانا نیز حضرت ذوالقرنین کا لوہے اور تانبے کے استعمال سے واقفیت اور ان کے ذریعے دیوار بنا کر قوم کی یاجوج و ماجوج سے حفاظت وغیرہ کا ذکر قرآن میں یونہی نہیں کیا گیا ہے بلکہ نفع بخش علوم کے حصول کی طرف رہنمائی مقصود ہے جو اسلامی تعلیمات کے عین مطابق اور کار ثواب کا باعث ہے۔

اسی طرح اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ ایک ترقی یافتہ معاشرہ کو ہر علم و فن کے حامل افراد کی ضرورت ہوتی ہے۔ مثلاً کسی سماج میں اگر کوئی ڈاکٹر نہ ہو تو اس کے افراد کی پریشانی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اسی طرح ایک منظم صورت میں حکومت کو چلانے کے لئے ہر سیکٹر میں ماہرین علم و فن کی ضرورت ہوتی ہے ورنہ بصورتِ دیگر غیروں پر انحصار کرنا پڑے گا۔ طبی تعلیم ہو یا جدید تکنیکی تعلیمات، عصر حاضر میں ان کی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کی تعلیم و ترغیب سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مگر تحصیل علم کے میدان میں قدم رکھنے سے پہلے کچھ شریعت اسلامیہ کے تقاضے ہیں جن کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ حسن نیت علم چاہے دینی ہو یا عصری حسن نیت یعنی

خالص رضائے الٰہی مقصود ہو۔فرمان نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے "انما الاعمال بالنیات" (البخاری:رقم:1) ''اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے'' صدق نیت کے بغیر اگر چہ ہم دنیا میں شہرت ونمود کے اعلی منازل طے کرلیں اور بہترین مبلغہ وواعظہ کا تمغہ حاصل کرلیں مگر آخرت میں ہمارا کوئی حصہ نہ ہوگا(اعاذنا اللہ منہ)

اسی طرح یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اگر کوئی ڈاکٹر محض اللہ کی رضا کے لئے اپنے دل میں خدمت خلق کا جذبہ لئے میڈیکل کی ڈگری حاصل کرتا ہے اور پھر عملی زندگی میں بھی کامیاب ہوتا ہے تو اس کی پوری زندگی معاشی ترقی کے ساتھ ساتھ عبادت الٰہی اور صدقہ حسنہ سے تعبیر کی جائے گی بشرطیکہ وہ بنیادی دینی تعلیم اور عمل صالح کے زیور سے آراستہ ہو۔اسی طرح جدید علوم سے لیس انسان اگر خالص نیت کے ساتھ جدید تکنیک کے میدان میں انسانیت کی آبیاری کا قصد رکھتا ہے تو اس کی بھی پوری زندگی سراپا عمل بن کر دونوں جہاں کی کامیابی سے سرفراز ہوگی۔

لہذا کسی بھی علمی میدان میں قدم رکھنے سے پہلے نیت کی درستگی ضروری ہے جہاں حصول علم کا مقصد محض ڈگری یا سند کا حصول نہ ہو۔حسن اخلاق وکردار کا مظاہرہ کرتے ہوئے دعوت دین کی ادائیگی کا احساس علم ہر مقام پر ادب اور حسن اخلاق کا متقاضی ہے۔نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:" من لم یرحم صغیرنا و لم یوقر کبیرنا و لم یعرف شرف علمائنا فلیس منا" (أبوداود وترمذی) ''جو ہم میں سے چھوٹوں پر شفقت نہیں کرتا، بڑوں کا احترام نہیں کرتا، علماء کی قدر نہیں کرتا، وہ ہم میں سے نہیں'' اسی بات کی مزید تائید نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول مبارک سے ہوتی ہے کہ " ادبنی ربی فأحسن تأدیبی" ''میرے رب نے میری بہترین تربیت کی'' اور دوسری جگہ فرمایا کہ:" إنما بعثت لأتمم مکارم الأخلاق"

(الادب المفرد: البخاری، رقم:273) ''مجھے حسن اخلاق کی تکمیل کے لئے بھیجا گیا ہے'' یہ تمام احادیث اس بات کی شہادت دیتی ہیں کہ رب کائنات نے اپنے حبیب کی بہترین تربیت کر کے انہیں حسن اخلاق کے اس اعلی مقام پر فائز کیا جس کی معطر فضا سے انسانیت مسحور ہوگئی۔

لہذا حصول علم اس بات کا متقاضی ہے کہ طالب علم حسن اخلاق و کردار کا وہ اعلی عملی نمونہ پیش کرے کہ عام مسلمانوں کے ساتھ ساتھ دوسری اقوام بھی اس کی خوشبو سے معطر ہو سکیں۔ اور دعوت دین کے میدان میں اس کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے کیونکہ حصول علم کا ایک اہم مقصد معرفت الہی کے ساتھ احیاء دین اور اعلاء کلمۃ اللہ ہے جہاں ہمیں اعلی اخلاق و کردار کا مظاہرہ کرتے ہوئے نہایت نرم اور دلکش لب ولہجہ اختیار کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ عالم دین کا وہ اعلی اخلاق و کردار ہی ہے جس کے اثر سے زمانہ قدیم سے غیر مسلم قومیں اسلام کے دامن میں پناہ لینے پر آمادہ نظر آتی ہیں۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے:

تم حسن سیرت کا وہ نمونہ بنو کہ دنیا پکار اٹھے
یہ کس چمن کی کلی کھلی ہے یہ کس گلستاں کا پھول مہکا

تبحر علمی

حصول علم اس بات کا متقاضی ہے کہ محض سطحی علوم یعنی ڈگری کے حصول کے لئے محض نصابی کتابوں یا سرگرمیوں پر قناعت نہ کریں بلکہ علم کے سمندر میں غوطہ زنی کر کے وہ گوہر آبدار بن کر نکلیں جس کی رعنائی سے دنیا متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اپنے موضوع میں اتنی گہرائی و گیرائی ہو کہ کسی بھی غیر معقول اعتراضات پر علوم شرعیہ کے دفاع پر قادر ہو لہذا ایسی صلاحیت کو نکھارنے کی کوشش ہو جن میں دقت نظر بھی ہو اور وسعت نظر بھی۔ اس ضمن میں علم کلام کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ جس کی مدد سے طلبہ ان تبحر علمی کا خزانہ ثابت ہوتے ہیں جو اپنے مضبوط

عقلی دلائل سے اسلام کی حقانیت کا لوہا منوانے پر مجبور کرسکیں۔تنقیدی وتفکیری ارتقاءتنقیدی و تفکیری ارتقاء حصول علم کے زریں اصولوں میں سے ایک ہے چنانچہ قرآن خود تخلیق کائنات اور خالق کائنات کے بارے میں غور وفکر اور عقلی استدلال کی تاکید کرتا ہے۔کہیں "افلا یتدبرون "کہہ کر مخاطب ہے تو کہیں" "كذلك نفصل الآيات لقوم يتفكرون"" اس طرح کی بے شمار آیات غور وفکر پر ابھارتی ہیں اور نقدی وفکری ملکہ سے غافل رہنے والوں کو بدترین جاندار سے تشبیہ دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے " إن شر الدواب عند الله الصم البكم الذين لا يعقلون " (الانفال:22)''بے شک اللہ کے نزدیک بدترین جاندار وہ بہرے اور گونگے ہیں جو عقل نہیں رکھتے،عقل سے کام نہیں لیتے''۔

اسی طرح نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز زندگی سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے بعض مواقع پر عقلی وفکری توجیہات کو مقدم کیا مثلاً معرکہ بدر میں مدینہ سے باہر نکل کر میدان کارزار میں آنا،غزوہ خندق کے موقع پر حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے مشورے پر خندق کھودوانا وغیرہ وغیرہ۔اس ضمن میں امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت قابل ذکر ہے۔ان کے بعض اختلافی نظریات سے قطع نظر،انہوں نے فکر وشعور کی راہ کو جو جلا بخشی اس سے انکار ممکن نہیں۔

لہذا وہ اپنی کتاب" المنقذ" میں فرماتے ہیں جس کا مختصر خلاصہ یہ ہے کہ" حالات کے تحت انہوں نے ہر مذہب وعقیدہ کے سمندر میں ڈوب کر اس سے اسی فکری جوہر کو تلاش نے کی کوشش کی تاکہ اس کے غیر معقول سوالات کے جوابات اسی نقطۂ نظر سے دینے کے قابل ہوسکیں اور اس طرح حق و باطل کی تمیز کرسکیں لہذا باطنیہ وظاہریہ کے روبرو ان کے عقائد کی چھان بین کی تو فلاسفر کے سامنے اس کے فلسفی جوہر کو تلاشنے کی بھرپور جد وجہد کی تو زاہد وصوفیاء سے ہم کلام

ہونے کے لئے زہد وتصوف کے اسرار ورموز تک پہنچنے کی کوشش کی وغیرہ وغیرہ۔ دینی علوم کو عصری وسائنسی دلائل سے پیش کرنے کی صلاحیت پر غور وخوض دور جدید میں حصول علم اس بات کا بھی تقاضا کرتا ہے کہ دینی علوم کو عصری وسائنسی دلائل سے پیش کرنے کی صلاحیت پر غور وفکر کی جائے۔ کیونکہ موجودہ نسل اسلام کی حقانیت کو تسلیم کرنے کے لئے جدید عصری وسائنسی براہین واستدلال کا تقاضا کرتی ہے۔لہذا ملک میں مروجہ زبان مثلاً ہندی، اردو، انگلش، اور سنسکرت اور کمپیوٹر کی تعلیم کے ساتھ ساتھ بعض بنیادی سائنسی نظریات میں مہارت پیدا کرنے کی کوشش کی جائے تاکہ موجودہ زمانہ کے سامنے اسلام کی صداقت کا بول بالا کیا جا سکے۔اس نظریہ کی تائید خود قرآن کریم سے ہوتی ہے کہ زمانہ جاہلیت میں شعر وقصہ جیسے فن ان کی تعبیرات کا خاصہ تھے لہذا قرآن نے اعلیٰ واجمل شعری اسلوب اختیار کرتے ہوئے کفار قریش کے باطل افکار ونظریات کی تردید کی۔

اسی طرح فن قصہ نگاری میں ان کے انہاک کو دیکھتے ہوئے قرآن قصہ نگاری کا بہترین پیرایہ اختیار کرتے ہوئے یوں مخاطب ہوا "نحن نقص عليك أحسن القصص " (یوسف:3) ''ہم آپ کے سامنے سب سے بہتر قصہ بیان کرتے ہیں'' اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہودیوں سے خط وکتابت کے ذریعے ربط قائم کرنے کے لئے حضرت زید بن ثابت کو سریانی زبان سیکھنے کا حکم دینا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ وہ تمام جدید علوم جو کسی بھی دور کی طاقت بن سکتے ہیں اور مسلم معاشرہ کو بہتری کی طرف لے جا سکتے ہیں، ان تمام میدان میں مسلم نوجوانوں کو آگے آنا چاہیے بشرطیکہ اس کے حصول کا مقصد دنیا طلبی ونام ونمود نہ ہو۔ چنانچہ قرآن وسنت اور ائمہ ومجتہدین کے نظریات کی ورق گردانی کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ حصول علم کا مقصد جو معرفت الٰہی سے عبارت ہے، جن چند اہم نکات کا تقاضا کرتا ہے وہ مندرجہ ذیل ہیں: حسن نیت

واخلاص لوجہ اللہ حسن اخلاق وکردار کا مظاہرہ کرتے ہوئے دعوت الی اللہ کے فریضہ کوانجام دیتے ہوئے اسلام کا بول بالا کرنا موضوع پر گہرائی و گیرائی تنقیدی وتفکیری تطور عصر حاضر کے متنوع سائنسی افکار ونظریات سے استدلال کرتے ہوئے دینی علوم کو ثابت کرنے کی کوششیہ وہ اہم نقطے ہیں جن کی مراعات کے بغیر حصول علم کا مقصد فوت ہو کر رہ جاتا ہے مگر افسوس کہ آج ہمارے یہاں ایسے تعلیمی ادارے خال خال ہی پائے جاتے ہیں جہاں ان کا لحاظ کیا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں حصول علم کے مقصد کو سمجھنے اور اس کے تقاضے کو پورا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔آمین۔

وما علینا الا البلاغ

مفتی اور فتوی

مفتی شکیل منصور القاسمی

فتوٰی اسم مصدر ہے، جسکی جمع ""فتاوٰی"" اور ""فتاوِی"" ہے۔"افتاء"یعنی کسی کو کوئی مسئلہ یا حکم بتادینے کو لغت میں "فتوی" کہتے ہیں۔شرعی اصطلاح میں پوچھنے والے شخص کو دلائل شرعیہ کے ساتھ حکم شرعی بیان کردینے کو"" فتوی"" کہتے ہیں۔"" مفتی"" اس کو کہتے ہیں جو قرآن و حدیث میں کامل دسترس رکھتا ہو۔دلائل ومصادر شرعیہ پہ جس کی گہری اور دقیق نظر ہو،غور وتدبر کی صلاحیت سے بھی مالا مال ہو،علوم شرعیہ ماہر اساتذہ فن سے سبقاً سبقاً پڑھا ہو۔پیش آمدہ مسائل وواقعات میں قرآن وحدیث کی روشنی میں لوگوں کی رہنمائی کرتا ہو۔اس فن کا موضوع علی العموم لوگوں کے افکار ونظریات پہ احکام خداوندی منطبق کرنا ہے۔"لوگوں پہ احکام بجبر واکراہ تھونپنا" اس کا موضوع نہیں ہے۔علامہ قرافی مالکی کے بقول: "مفتی اللہ کا ترجمان" اور علامہ ابن القیم کے بقول: "مفتی اللہ کا ایسا وزیر ہے جو احکام شاہی پہ مہر لگانے کے منصب پہ فائز ہو"۔ابن المنکدر کا خیال ہے کے "مفتی" اللہ اور اس کی مخلوق کے درمیان ایک واسطہ ہے۔

رسالت م آب کے زمانے میں حضور نبی اکرم خود منصب افتاء پر فائز تھے، وحی کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی طرف سے فتویٰ دیا کرتے تھے،آپ کے فتاویٰ جوامع الکلم تھے، اگر حضرات صحابہ کرام آپ سے پیش آنے والے مسائل سے متعلق سوالات کرتے تو آپ وحی کے ذریعے سے ان کے جوابات مرحمت فرماتے تھے ، چنانچہ قرآن کریم میں آیا ہے ''وَيَسۡتَفۡتُونَكَ فِي ٱلنِّسَآءِۖ قُلِ ٱللَّهُ يُفۡتِيكُمۡ فِيهِنَّ'' (النساء:127) لوگ آپ سے

عورتوں کے بارے میں مسئلہ پوچھتے ہیں آپ کہہ دیجئے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں ان عورتوں کے بارے میں فتویٰ دیتا ہے۔اسی طرح قرآن وسنت میں صحابہ کرام رضوان اللہ تعالی علیہم اجمعین کے سوالات اورآپ کی طرف سے دیے گئے جوابات (فتاویٰ) مذکور ہیں۔آپ کے یہ فتاویٰ (احادیث) اسلام کے احکام کا دوسرا ماخذ ہیں، ہرمسلمان کے لیے ان پرعمل کرنا ضروری ہے، اوراس سے کسی کوانحراف کرنے کی اجازت نہیں۔(ارشاد المفتیین)

نبی کریم کے اس دنیا سے وصال فرماجانے کے بعد فتویٰ کے کام اور ذمہ داری کو صحابہ کرام نے سنبھالا اور بہت احسن طریقے سے انجام دیا ،حضرات صحابہ کرام فہم وفراست اورذہانت وذکاوت میں مختلف درجات کے حامل تھے ؛ چنانچہ ان میں سے جوحضرات فتویٰ دیا کرتے تھے ان کی تعداد ایک سوتیس (130) سے کچھ زائد تھی۔(اعلام الموقعین: ج،۱،ص ۱۲)

البتہ زیادہ فتویٰ دینے والے سات حضرات کے اسماء گرامی مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) حضرت عمر بن خطابؓ

(۲) حضرت علی بن ابی طالبؓ

(۳) حضرت عبداللہ بن مسعودؓ

(۴) حضرت عائشہؓ

(۵) حضرت زید بن ثابتؓ

(۶) حضرت عبداللہ بن عباسؓ

(۷) حضرت عبداللہ بن عمرؓ۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دورمبارک میں بفضل خداوندی بہت فتوحات حاصل ہوئیں، اس وجہ سے حضرات تابعین مختلف بلاد اسلامیہ میں دین متین کی خدمت سرانجام دے رہے تھے، اکثر بلاد اسلامیہ میں ایسے حضرات مقرر تھے جولوگوں کی رہنمائی کرتے ، مدینہ منورہ

میں حضرت سعید بن المسیب ،حضرت ابوسلمہ بن عبدالرحمن بن عوف ،حضرت عروہ بن الزبیر،حضرت عبیداللہ،حضرت قاسم بن محمد،حضرت سلیمان بن یسار اور حضرت خارجہ بن زید۔ انہی حضرات کو"فقہاء سبعہ" بھی کہا جاتا ہے۔ان کے علاوہ حضرت حسن بصری،حضرت ابراہیم نخعی،حضرت مسروق،حضرت علقمہ بھی افتاء کی خدمات سرانجام دیتے تھے،اس کے بعد دوسری صدی ہجری میں فقہ وافتاء کے بڑے بڑے ائمہ اور مجتہدین پیدا ہوئے ،جنہوں نے فقہ وفتاویٰ اوراجتہاد واستنباط کے حوالے سے کارہائے نمایاں انجام دیئے؛ چنانچہ انہی مجتہدین میں سے چار حضرات: امام اعظم ابوحنیفہ،امام مالک،امام شافعی اورامام احمد بن حنبل کی تدوین کردہ فقہ کو امت کے سواد اعظم نے قبول کیا ہے۔"

افتاء یعنی فتوی دینا ایک عظیم الشان منصب ہے،اس کی فضیلت واہمیت ہر شخص پر روز روشن کی طرح عیاں ہے۔اوپر کی سطروں سے اس کا بخوبی اندازہ ہوگیا ہوگا۔

فقہاء کرام اور مفتیان عظام کی وہ جماعت جنہوں نے اپنے آپ کو استنباط احکام اور استخراج مسائل کے لئے مختص کیا اور حلال وحرام کو معلوم کرنے کے لیے قواعد وضوابط مرتب کیے وہ تاریک رات میں ستاروں کی مانند ہیں اوریہی لوگ انبیاء کرام علیہم السلام کے حقیقی وارث ہیں، نبی کریم کا ارشاد گرامی ہے ۔"إن العلماء ورثة الأنبياء، إن الأنبياء لم يورثوا ديناراً ولا درهما، وأورثوا العلم، فمن أخذه، أخذ بحظ وافر"(رواہ أبوداود:3641والترمذی :،2682وابن ماجہ:،223وأحمد:21763)

قرآن کریم میں:" اولوالامر کی اطاعت اورفرمانبرداری کوواجب اورضروری قرار دیا گیا ہے يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ ۖ(النساء:59) اے ایمان والو! اطاعت کرواللہ کی اور اطاعت کرورسول کی اوراولی الامر کی، ایک تفسیر کے مطابق {اولوالامر} سے مراد حضرات علماء اورفقہاء ہیں ۔امام شاطبی

رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: مفتی امت میں افتاء اور تبلیغ کے اعتبار سے نبی کریم کا قائم مقام ہوتا ہے، چنانچہ امام شاطبی لکھتے ہیں۔" "وعلی الجملة فالمفتی مخبر عن اللہ تعالیٰ کالنبی ونافذ امرہ فی الامة بمنشور الخلافة کالنبی " الحاصل مفتی لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے احکامات کی خبر دیتا ہے اور اس کے ارشادات کو لوگوں پر نافذ وجاری کرتا ہے۔

(الموافقات: ج٤، ص: ٢٤٤ تا ٢٤٥)

افتاء کی اسی اہمیت کے پیش نظر اس منصب پہ فائز شخص کے لئے درج ذیل اوصاف وشرائط سے متصف ہونا بھی ضروری ہے:

الف:۔ عاقل بالغ مکلف ہونا۔

ب:۔ شریعت کے ضروری علم کا حامل ہونا۔

ج:۔ درجۂ ثقاہت پر فائز ہونا۔

د:۔ فقہی طبعیت، ذہن میں سلامتی اور غور وفکر کی صلاحیت ہونا۔

ہ:۔ منکرات ومعاصی سے پوری طرح اجتناب کرنے والا ہونا۔

و:۔ بداخلاقی اور بے مروتی سے محفوظ ہونا۔

ز:۔ منفعل المزاج نہ ہونا۔

ک:۔ دنیا سے بے رغبت ہونا۔ظاہری ہیئت، وضع قطع اور لباس وپوشاک کے لحاظ سے بھی مفتی کو ان صفات سے متصف ہونا چاہئے:۔

مفتی کو لوگوں کے سامنے باوقار لباس میں آنا چاہئے، مفتی اپنی وسعت کے مطابق دائرۂ شریعت میں رہتے ہوئے، اچھا لباس زیبِ تن کرے، اور طہارت ونظافت کا اہتمام رکھے؛ کیونکہ اگر آدمی کی ظاہری ہیئت قابل قبول نہ ہو، تو اس کی بات کا وزن بھی عام لوگوں کی نظر میں زیادہ نہیں ہوتا۔ (اصول الافتاء وآدابہ: ٣٢٤)

اکیسویں صدی میں سوشل میڈیا کے شیوع نے ترسیل معلومات کی دنیا میں انقلاب برپا کردیا ہے خطرات ومضار کے ساتھ فوائد ومنافع کی بھی ارزانی وفراوانی ہے جہاں اسلامی تعلیمات کی ترویج وفروغ منبر ومحراب اور کتب ورسائل پر موقوف تھا وہیں آج سوشل میڈیا کے توسط سے ایک لمحے میں اسلامی تعلیمات دنیا کے ایک کونہ سے دوسرے کونہ تک پہنچا سکتے اور اغیار کے شکوک وشبہات کا ازالہ کر سکتے ہیں، لیکن یہاں ساتھ میں دلخراش المیہ یہ بھی ہے کہ اس پلیٹ فارم پر شخصیات کی ہویت وحیثیت مخفی رہتی ہے، نام نہاد مفتی ومحقق یہاں سرگرم رہتے ہیں، شرعی ہدایات ورہنمائی کے لئے مجہول الہویہ سوشلستانی شخصیات وحلقے سے رابطے کی بجائے معتبر ومستند علماء سے حاصل کریں جو آپ کو قرآن وسنت اور اقوال فقہاء کی روشنی میں مسئلے کا حل بتا سکیں: فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (سورۃ النحل 43) پس اگر تم نہیں جانتے تو اہل علم سے دریافت کرلو۔

ادلہ شرعیہ: قرآن، سنت، اجماع امت اور قیاس سے مستنبط احکام شرعیہ (فتاوی) کو دیدہ دانستہ توہین واستخفاف کی نیت سے مفتیوں کی "" خانہ ساز" آراء" کہنا یا اس طرح کے دیگر تنقیصی فقرے وجملے کسنا انتہائی خطرناک امر اور باعث کفر ہے۔ رجل عرض علیه خصمه فتوی الأئمة فردها وقال: ''چہ بار نامہ فتوی آوردہ''۔ قیل یکفر لأنه رد حکم الشرع وكذا لو لم يقل شيئاً لكن ألقى الفتوى على الأرض وقال: ''ایں چہ شرع است'' کفر۔ (الفتاوی الہدیۃ ۲/ ۲۷۲، کتاب السیر، الباب التاسع فی أحکام المرتدین، مطلب موجبات الکفر ومنہا ما یتعلق بالعلم والعلماء ، الفتاوی التاتارخانیۃ: 262/ 4، کتاب أحکام المرتدین، فصل فی العلم والعلماء۔۔۔الخ)

رجع من مجلس العلم فقال آخر: ''از کشت آمد''۔ وقال: ''مرا بعلم چہ کار''۔ أو قال: من يقدر على أداء ما يقولون أو ألقى الفتوى على الأرض أو قال: ''چہ بار

نامہ آوردی'' عند روية الفتوى أو قال: ''ایں چہ شرع است'' يكفر لأنه رد حكم الشرع۔ (الفتاوى البزازية على هامش الهندية 337 / 6، كتاب ألفاظ تكون إسلاماً وكفراً، الفصل الثاني، النوع الثامن في استخفاف العلم والعلماء) آج کل ذرائع ابلاغ بالخصوص سوشل میڈیا پہ فتاوی کے بخئے ادھیڑنے اور انہیں مسلمانوں کی نظروں میں بے وقعت کرنے کی منظم سازشیں عروج پہ ہیں۔ بعض پڑھے لکھے مسلم دانشوران بھی اس کے شریک کار بن جاتے ہیں۔ خدارا ایسے احباب اپنے ایمان کی خیر منائیں۔ علماء دین اوران کے فتاوی کی توہین کر کے اپنی دنیا وآخرت برباد نہ کریں۔

واللہ یھدی من یشاء الی صراط مستقیم۔

علوم قاسمیہ تعارف و تجزیہ

حفظ الرحمن الاعظمی

خدا بہتر جانے کیا وجہ ہوئی لیکن یہ سچ ہے کہ اپنے قافلہ سالار" حضرت نانوتوی" کو" حالات طیب، سوانح قاسمی، حضرت قاسم نانوتوی حیات و خدمات، اور احوال و آثار کے خصوصی نمبر کی روشنی میں جاننے کے بعد بھی ایک زمانے تک آپ کی کتابوں سے استفادے کی توفیق نہ مل سکی، بہت زیادہ اگر ہوا تو صرف اتنا کہ فریق مخالف کی کرم فرمائیوں کی بدولت" تحذیر الناس" کی تین مختلف جگہ کی عبارتوں کو پڑھنے، سننے اور سمجھنے کی کچھ توفیق حاصل ہوگئی، یا کسی نکتہ ور کی تحریروں میں نکات نانوتوی کے کچھ پہلو سامنے آ گئے؛ بس، علوم نانوتوی سے آگہی کی یہی کل کائنات تھی۔

لیکن آج سے چار پانچ سال قبل پہلی بار حضرت نانوتوی کی تصانیف سے باقاعدہ روبرو ہونے کا موقع ملا، پیش مقصد تو حضرت کی صرف ایک کتاب تھی، لیکن جوں جوں اوراق پلٹتا گیا علم و حکمت کی ایک نئی دنیا سے آشنائی ہوتی گئی، حسن استدلال کی ایک نئی جنت نگاہوں کے سامنے جلوہ گر ہوتی گئی، تخیل کی بلندی، افکار کی وسعت اور بحث و نظر کی گہرائی کا جو عالم آپ کی تحریروں میں نظر آیا کم از کم اس عمر میں مجھے بہت کم مصنفین کے یہاں دیکھنے کو ملی۔ عقیدت و محبت تو اس قافلے کے ہر حدی خواں سے ہے خواہ وہ شہرت کی بلندیوں میں پرواز کرنے والا ہو یا گمنامی کی قبا اوڑھے دین حنیف کی خدمت میں منہمک ہو، مگر علوم نانوتویہ پر اطلاع کے بعد علمی رسوخ، اور معارف و حکم پر دسترس کی بنیاد پر جذباتیت کا جو رشتہ حضرت نانوتوی سے قائم ہوا ہے وہ میرے لئے سرمایہ حیات سے کچھ کم نہیں۔

حضرت نانوتوی رح بحیثیت مصنف

حضرت نانوتوی اصلاتو عملی میدان کے آدمی تھے، چاہے وہ دارالعلوم دیوبند کا قیام ہو یا جنگ آزادی کی جد و جہد، خلافت عثمانیہ کی بقاء کا مسئلہ ہو یا تحریک عقد بیوگان؛ حضرت نانوتوی ہرمحاذ پر کشتی اسلام کی ناخدائی کا فریضہ انجام دیتے نظر آتے ہیں؛ تصنیف وتالیف سے آپ کو کوئی خاص دلچسپی نہ تھی، یعنی عام مصنفین کی طرح لکھنے کے لئے خاص ماحول کا ہونا، کتابوں کے انبار کو پہلے مراجعت کے لئے جمع کر کے رکھنا، اور روزانہ کچھ نہ کچھ لکھتے رہتا اس طرح کا کوئی خاص اہتمام نہ تھا، اس کے باوجود بھی حسب ضرورت آپ نے جب بھی قلم اٹھایا تو سادے کاغذ کو علوم ومعارف کا خزینہ اور حقائق ودقائق کا گنجینہ بنادیا، آپ نے اسلام کی حقانیت، توحید باری تعالی، رسالت م آب صلی اللہ علیہ وسلم کی عالمگیریت، حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم، قرأت خلف الامام، تراویح، اسرار شریعت، ردنصاری اور ردتشیع جیسے موضوع پر ہزاروں صفحات رقم فرمائے۔ آپ کی تصنیف میں حاشیۂ بخاری، اسرار قرآنی، انتباہ المؤمنین، تصفیۃ العقائد، انتصار الاسلام، آب حیات، تحفۂ لحمیہ، مصباح التراویح، الحق الصریح، توثیق الکلام فی الانصات خلف الامام، اجوبۂ اربعین، ھدیۃ الشیعہ، تقریر دلپذیر، حجۃ الاسلام، قبلۂ نما، تحذیر الناس، مناظرۂ عجیبہ اور تنویر النبر اس بطور خاص ہیں؛ ادارۂ تالیفات اشرفیہ ملتان نے آپ کی تمام تصانیف کو" مقالات حجۃ الاسلام" کے نام سے 17 جلدوں میں شائع کی ہے جس کی ضخامت سات ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔

تصنیفات نانوتوی کی خصوصیت

علوم نانوتویہ لعل وگہر کے اس وسیع سمندر کا نام ہے جس کی وسعت وگہرائی کا اندازہ لگانا اور اس کی تہوں میں پوشیدہ یاقوت وزمرد تک رسائی حاصل کرنا مجھ جیسے ہیچمداں کے لئے ممکن ہی

نہیں، پھر بھی ورق گردانی کے دوران جن چیزوں نے مشام جاں کو معطر کردیا اس کو خصوصیت کے عنوان سے تحریر کررہا ہوں، اس نوٹ کے ساتھ کہ بعض جگہوں پر الفاظ وتعبیرات اکابرین کی تحریروں سے مستعار ہیں۔

(۱) حضرت نانوتوی کی تحریروں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ جزئی واقعات، جسے عام قارئین واقعۂ محض سمجھ کر سرسری گزر جاتے ہیں، حضرت نانوتوی انھیں واقعات سے اس طرح استدلال کرتے ہیں کہ شریعت کی ہر کلی اور ہر کلی کے تحت نکلنے والے سیکڑوں جزئیات اپنے اپنے محل پر منطبق نظر آتے ہیں مثلاً ابوبکر صدیق رض کا شمار اولین سابقین میں بھی سرفہرست ہے، یہ بات ہر کہ ومہ کو معلوم ہے، ہر شخص اسے صرف تاریخی تقدیم وتاخیر اور ابوبکر کی خوش نصیبی سمجھتا ہے، لیکن حضرت نانوتوی نے "تحذیر الناس" میں اسے ایسے طور پر پیش کیا ہے کہ ابوبکر کے سبقت ایمانی کی علت، آپ رض کو صدیق کہنے کی وجہ، آیت قرآنی "اولئک الذین انعم اللہ علیھم من النبیین والصدیقین" میں انبیاء کے ساتھ صدیقین کو ذکر کرنے کی مناسبت، اور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان "ماسب اللہ فی صدری سببت فی صدر ابی بکر رض" کی تشریح وتوضیح بھی مکمل طور پر سمجھ میں آ گئی۔

(۲) امور شرعیہ ----خواہ وہ اللہ کی ذات وصفات ہوں یا نبی کی نبوت ورسالت یا دیگر سمعیات ----دین کے ہر معاملے کو آپ عقلی دلیلوں اور روزمرہ کے مشاہداتی تمثیلوں سے اس زور وقوت کے ساتھ پیش کرتے ہیں جسے تسلیم کرنا ہر فطرت سلیمہ کی مجبوری ہے۔ مثلاً "الاجوبۃ الکاملہ میں بدعت کی قباحت وشناعت پر کلام کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں: جیسے ہمارے تمہارے جسم میں ہاتھ پاؤں آنکھ ناک اعضاء ہیں، اور ہر ایک کے لئے ایک مقدار ہے، دو ہاتھ، دو پاؤں، دو آنکھیں، پانچ انگلیاں ہر ہر ہاتھ پاؤں میں، ایک منھ، ایک ناک علی ھذا القیاس

دین میں بھی بہت سے ارکان ہیں، یعنی نماز، روزہ، حج، زکوۃ، اور پھر ہر ایک کی ایک مقدار ہے؛ نمازیں رات دن میں پانچ، تو روزہ برس بھر تیس، علی ھذاالقیاس زکوۃ ہر سال ہے، حج عمر بھر میں ایک بار۔۔۔مگر جیسے آنکھ ناک اپنی مقدار معین سے کم ہو جب بھی بری معلوم ہو، زیادہ ہو جب بھی بری، ایک ناک کی جگہ اگر دو ناکیں ہوں اور دو آنکھوں کی جگہ اگر تین ہوں ویسے ہی بری معلوم ہونگی، جب کہ فرض کیجیئے کسی کے اصل ناک نہ ہو یا آدھی ہو، بالجملہ جیسے ہمارے تمہارے وجود میں کمی بیشی اپنے انداز سے بری معلوم ہوتی ہے ایسے ہی دین میں بھی کمی بیشی اندازۂ نبوی سے بری اور ناموزوں ہوگی۔ (الاجوبۃ الکاملہ ص:٦)

(۳) حضرت نانوتوی کی تحریریں اصلھا ثابت وفرعھا فی السماء کی مصداق ہوتی ہیں ، یعنی آپ کے مضامین جس قدر بلند پایہ ہوتے ہیں اسی قدر اس میں گہرائی و گیرائی بھی ہوا کرتی ہے، لیکن ایسے دقیق اور غامض علوم کے باوجود بھی آپ کا پیرایۂ بیاں نہایت ہی آسان اور شگفتہ، مقدمات کی ترتیب طبعی وفطری ہوتی ہے کہ تھوڑا سا غور وفکر کرنے کے بعد مقصود و مدعا حاصل ہوجائے؛ مثلاً مخلوق کے زوال سے خالق کے وجود پر استدلال کرنے کے لئے حضرت نانوتوی نے کس سلیقے سے مقدمات کو ترتیب دیا ہے، اسے مولانا بدر الحسن قاسمی زید مجدھم کی زبانی ملاحظہ فرمائیں:

> جب ہم اپنے وجود پر غور کرتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے وجود کو ثبات وقرار نہیں، نہ وہ ازل سے ہے اور نہ ہی ابد تک رہنے والا ہے، ہم پر ایک ایسا زمانہ گزرا ہے کہ ہم پردۂ عدم میں تھے، اور ایک ایسا وقت آئے گا کہ ہمارا وجود ختم ہوجائے گا۔ ہمارے وجود کا اس سے زائل ہوجانا اور ہماری ذات سے علاحدہ ہوجانا اور ہمارا ہمیشہ ہمیش اس دنیا میں نہ رہنا بانگ دہل یہ اعلان کر رہا ہے کہ ہمارا وجود ذاتی نہیں ہے اور اسی طرح ہر مخلوق کا وجود ذاتی نہیں ہے، بلکہ جو موجود اصلی ہے اس کا عطا کردہ ہے۔ ہماری مثال تو ایسی ہی ہے جیسا

کہ ہم دیکھتے ہیں کہ آگ کے قریب ہونے کی وجہ سے پانی گرم ہوجاتا ہے اور آگ کی گرمی اس میں سرایت کرجاتی ہے، پھر جب آگ سے اس کا رشتہ کٹ جاتا ہے تو اس کی ذاتی برودت لوٹ اتی ہے، اور وآگ کے قرب سے حاصل شدہ حرارت زائل ہوجاتی ہے، اسی طرح زمین آفتاب عالم تاب کی روشنی میں منور ہوجاتی ہے، پھر جب سورج ڈوبنے لگتا ہے تو زمین کی روشنی بھی اہستہ اہستہ لوٹنے لگتی ہے یہاں تک کہ جب سورج مکمل طور پر غروب ہوجاتا ہے تو زمین کی ذاتی ظلمت اور تاریکی لوٹ اتی ہے بار بار یہ مناظر دیکھنے کی وجہ سے وجہ سے ہمیں اس بات کا یقین ہوگیا کہ نہ تو زمین کی روشنی ذاتی ہے اور نہ پانی گی حرارت ذاتی ہے، بلکہ زمین سورج سے حاصل شدہ روشنی سے چمکا اٹھتی ہے، اور پانی آگ کی عطا کردہ حرارت سے گرم ہوجاتا ہے اسی طرح ہمارے وجود کا دوعدموں سے گھرا ہونا واضح طور پر بتلاتا ہے کہ ہمارا وجود زمین کی روشنی اور پانی گی حرارت کی طرح عارضی ہے چنانچہ جب اس ذات کی طرف سے فیض منقطع ہوجاتا ہے جو ہمیں وجود بخشنے والا ہے تو ہم ختم ہوجاتے ہیں اور عدم کے دبیز پردے میں جا چھپتے ہیں۔ جب یہ بات ثابت ہوگئی تو ہمیں جان لینا چاہئے کہ جس طرح حرارت کا سلسلہ (دنیائے اسباب میں) آگ پر ختم ہوتا ہے اور روشنی کا سلسلہ سورج پر، چنانچہ ہم نہیں کہہ سکتے کہ سورج سے اوپر کوئی چیز اس دنیائے اسباب میں ایسی ہے جس سے سورج کو روشنی ملتی ہے، اور نہ اگ سے اوپر کوئی چیز ہے جس سے آگ کو حرارت ملتی ہو، تو سورج کی روشنی اور اگ کی حرارتو اصلی کہلائے گی، اسی طرح وجود کا سلسلہ بھی کسی نہ کسی ایسی ذات پر ختم ہونا چاہئے جس کا وجود ذاتی ہو، کسی اور سے مستفاد نہ ہو، وہی موجود اصلی ہے، جس نے ھم سبھوں کو وجود بخشا، اسی کو اللہ، رب، اور مالک الملک کے نام سے جانتے ہیں۔ (قاسم نانوتوی: حیات وخدمات ص170)

علوم نانوتویہ کی دور حاضر میں ضرورت واہمیت

حضرت نانوتوی کی تصانیف ڈیڑھ سو سال پرانی ہیں، لیکن ان کی اہمیت وافادیت جس

طرح اس زمانے میں مسلم تھی وہی افادیت آج بھی برقرار ہے، اگر ذرا سا پہلو بدل دیا جائے تو آپ کا لکھا ہوا ہر ورق ہر سطر دور حاضر کے مزاج و مذاق سے ہم اہنگ ہوگا، اور صرف مذاق سے ہم آہنگی ہی نہیں بلکہ یہ کتابیں ہر سلیم الطبع، اسلام پسند اور فتنوں کا تعاقب کرنے والوں کی حاجت وضرورت بھی ہونگی، کیونکہ آپ کی تحریریں علم کلام میں ایک نئی پیش رفت ہے جو دور حاضر کے تقاضوں پر پوری بھی اترتی ہے اور موجودہ الحاد وتشکیک کے تار و پور بکھیرنے کی صلاحیت بھی رکھتی ہے۔

ہم جس دور میں سانس لے رہے ہیں وہ دور سائنس کی معراج کا دور ہے، اور سائنس میں منقولات تو کجا معقولات کی بھی گنجائش کم نکلتی ہے کیونکہ وہاں صرف مشاہدات کی بنیاد پر باتیں کہی اور سنی جاتی ہے، مزید برآں دور حاضر کا الحاد بھی اسی سائنس کی پیٹھ پر سوار ہوکر اسلامی اصول پر تنقید کے گولے برسا رہا ہے، اس لئے ضرورت تھی ایسے علم کلام کی جہاں اسلامی حقائق کو خالص عقلی دلیلوں کی روشنی میں ثابت کیا گیا ہو، اور پھر ان حقائق کو آج کے محسوسات اور دور حاضر کے حسی شواہد و نظائر سے مدلل بھی کیا گیا ہو، تا کہ اسلام کے غیبی امور، شریعت کے بنیادی مقاصد، اور دین فطرت کے مبانی و اصول اس حسیاتی رنگ استدلال سے بالکل طبعی اور محسوس و مشاھد نظر انے لگیں خوشا بختی کہ حضرت نانوتوی رح کی جملہ تصنیف انھیں خصوصیات سے بھری پڑی ہیں، آپ امور شرعیہ کے اثبات کے لئے بھی منقول کی بجائے معقول کا سہارا لیتے ہیں، توحید و رسالت جیسے خالص اسلامی نظریئے کو بھی آپ قرآن کی آیتوں اور احادیث کی عبارتوں سے مزین نہ کر کے فلسفیانہ اور سائنٹفک انداز میں پیش کرتے ہیں، وہ بھی روزمرہ کے مشاہدات کی دلکش مثالوں کے ساتھ؛ حتی کہ واقعات وسوانح پر بھی آپ اسی انداز میں بحث کرتے ہیں۔ اس لیے یہ بات پورے شرح صدر کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ دور حاضر کو علوم نانوتویہ کی اتنی ہی ضرورت ہے جتنا کہ ان کے زمانے کو تھی، بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ۔

حضرت نانوتوی کی تحریروں سے استفادے کے اصول

یہ تو امر واقعی ہے کہ حضرت نانوتوی کی کتابیں عام مصنفین کے مقابلے بے انتہا دشوار اور مشکل ہیں، ان کی صعوبت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ" شیخ الہند" جیسی عبقری شخصیت کو بھی انھیں سبقا سبقا پڑھنے کی حاجت محسوس ہوئی ؛لیکن پھر بھی اگر دوران مطالعہ چند باتوں کا خیال رکھا جائے تو یقین ہے کہ آپ رح کی کتابیں کچھ حد تک آسان ہوجائیں گی۔

(۱) حضرت نانوتوی رح اپنی عادت کے مطابق جب بھی کسی موضوع پر گفتگو فرماتے ہیں تو تقریب فہم کے لئے موضوع پر کلام کرنے سے پہلے متعلقات موضوع پر سیر حاصل بحث کرتے ہیں حتی کہ وہ گفتگو کبھی کبھی طویل سے طویل تر ہوجاتی ہے، اور آپ کا یہ اسلوب آپ کی ہر تصنیف ---خواہ وہ مختصر رسالہ ہو یا ضخیم کتاب ---ہر ایک جگہ پایا جاتا ہے، اس لئے قارئین کے لئے ضروری ہے کہ وہ حضرت کی کتاب کا مطالعہ شروع کرنے سے پہلے کتاب میں موضوع اور متعلقات موضوع کی تعیین کرلیں تا کہ استفادہ آسان ہوسکے۔

(۲) عام طور پر کہا جاتا ہے کہ حضرت نانوتوی کی اکثر کتابیں چونکہ اپنے ذہین و فطین تلامذہ کو لکھے گئے خطوط پر مشتمل ہیں اس لئے اس میں تصنیفی اصول کی رعایت نہیں کی گئی ہے، انداز بیان غیر مرتب بھی ہے اور کسی قدر الجھا ہوا بھی ۔لیکن خاکسار اس نظریئے سے بالکل بھی متفق نہیں ہے، اس کے نزدیک حضرت نانوتوی کی کتابوں میں جو حسن ترتیب پائی جاتی ہے وہ دور حاضر کے بعض قلم کاروں کے یہاں بھی مثل عنقاء ہے، بس بات اتنی ہے کہ آپ کے بلند پایہ مضامین اور باریک استدلال میں الجھ کر نگاہیں اس حسن کا ادراک نہیں کر پاتیں، ورنہ تو حضرت نانوتوی کی کتابوں کو باسانی باب وار فصل وار بھی مرتب کیا جاسکتا ہے جو فہم کتاب میں معاون ثابت ہونگے ۔

(۳) آپ کی کتابوں سے استفادہ کے لئے منطق وفلسفہ کی اصطلاحوں سے واقفیت ضروری ہے، کیونکہ آپ کا کلام منطق وفلسفہ کی ہی زبان میں وارد ہوا کرتا تھا، حضرت شیخ الہند کا بیان ہے کہ جب تک حضرت الاستاذ باحیات تھے ہم آپس میں منطق کا دور کیا کرتے تھے، اس لئے طالبان علوم نانوتویہ کے لئے یہ شرط اول ہے کہ وہ منطق وفلسفہ کی اصطلاحات سے کم از کم اتنی واقفیت تو ضرور پیدا کرلیں کہ یہ اصطلاحیں حصول فیض سے مانع نہ ہوں۔

(۴) حضرت نانوتوی رح کی تحریروں میں مکررات کثرت سے پائے جاتے ہیں، لیکن وہ اس انداز کے ہوتے ہیں کہ ایک کتاب میں اسے بہت ہی مختصر انداز میں پیش کیا گیا ہے تو دوسرے میں قدرے وضاحت کے ساتھ، اور تیسرے میں پوری تفصیل بیان کردی گئی ہے، ایسے میں ہم جیسے ظلوم وجہول کے لئے لازم ہے کہ کلام نانوتوی کے ایک حصے کو متن بنائیں تو دوسرے حصے کو اس کی شرح، اور یہ تبھی ممکن ہے جب آپ کی جملہ تصنیف ہماری نگاہوں کے سامنے ہو، آپ کی کتابوں کے مباحث اور مباحث میں پیش کئے گئے دلائل اور تمثیلات و تشبیہات کا ہم نے کم سے کم ایک بار ضرور مطالعہ کیا ہو۔

(۵) حضرت نانوتوی کی تصانیف میں ربط ماقبل کا سمجھنا کلید کی حیثیت رکھتا ہے، بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ ربط ماقبل کو سمجھے بغیر کلام نانوتوی اور مراد نانوتوی کا سمجھنا محال ہے تو شائد غلط نہ ہوگا، یہی وجہ ہے کہ جب جب بھی آپ کی کتابوں پر عنوان وحاشیہ وغیرہ کا کام کرنے والوں نے ربط ماقبل سے غفلت برتی تو وہ مراد سے بہت دور ہو گئے۔

تصنیفات نانوتوی اور نسل جدید

حضرت نانوتوی رح کے تجدیدی کارناموں میں یوں تو قیام دارالعلوم سب سے نمایاں ہے، لیکن آپ کی تصنیفات بھی آپ کے کارناموں کا ایک جلی عنوان ہے، آپ کی تصنیفات

کے بارے میں " شیخ الہندؒ "تحریر فرماتے ہیں:

" طالبان حقائق اور حامیان اسلام کی خدمت میں ہماری درخواست ہے کہ: تائید احکام اسلام اور مدافعت فلسفہ قدیمہ وجدیدہ کے لئے جو تدبیریں کی جاتی ہیں ان کو بجائے خود رکھ کر حضرت خاتم العلماء کے رسائل کے مطالعے کے میں بھی کچھ وقت ضرور صرف فرمادیں، اور پورے غور سے کام لیں، اور انصاف سے دیکھیں کہ ضروریات موجودہ زمانۂ حال کے لئے وہ سب تدابیر سے فائق، اور مختصر اور بہتر اور مفید تر ہیں یا نہیں؟

حضرت نانوتویؒ کی یہ علمی فتوحات اپنے جلو میں کیا کیا خوبیاں رکھتی ہیں اس کا انداز ہ مولانا حکیم فخر الاسلام صاحب مدظلہ العالی کے اس بیان سے لگایا جاسکتا ہے، اپ تحریر فرماتے ہیں:

" حضرت نانوتوی کی تصنیفات زمان ومکان اور قوموں ونظریوں کی حد بندیوں سے بے نیاز آفاقی نوعیت کی حامل ہیں، آپ کی تصانیف میں عہد بہ عہد بدلتے اور نئی نئی شکل اختیار کرتے عقلی وسائنسی اصول ومسائل پر کلام کیا گیا اور عقل کی راہ سے شرعی عقائد واحکام کی مدافعت کے نئے اصول مرتب کئے گئے ہیں۔

"ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:"

آپ کی تصانیف کا خالص معقول فلسفیانہ اور سائنٹفک پیرایۂ بیاں اس قدر موثر ہے کہ ان تصانیف کی مدد سے عہد جدید میں دفاع اسلام کے لئے نہایت مضبوط بنیادوں پر رجال کار تیار کئے جاسکتے ہیں۔

" مذکورہ بالا اقتباسات کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے آپ کے کارناموں میں اگر دار العلوم دیوبند عملی گمراہیوں کو روکنے کے لئے سد سکندری کی حیثیت رکھتا ہے تو آپ کے علوم کو فکری گمراہیوں کے خلاف ایک تیغ براں کا نام دیا جاسکتا ہے، آپ کی تصنیفات علم کلام کے جدید تقاضوں کو پورا کرنے کی صلاحیت بھی رکھتی ہے، اور معقولات کی قبیل سے اسلام پر وارد ہونے

والے ہر اعتراض کا کافی وشافی جواب بھی بنتی ہے، انھیں خصوصیات کی بنا پر" شیخ الہندؒ" نے اپنے نیک خیالات کا اظہار کبھی یوں کیا تھا:"

خدام عالیہ مدرسہ دیوبند نے تو یہ تہیہ بنام خدا کرلیا ہے کہ تالیفات موصوفہ۔۔۔
کسی قدر توضیح وتسہیل کے ساتھ عمدہ چھاپ کرا ور نصاب تعلیم میں داخل کر کے ان کی
ترویج میں اگر حق تعالیٰ توفیق دے تو جان توڑ کر ہر طرح کی سعی کی جائے۔

" لیکن اسے دور حاضر کا سب سے برا المیہ کہا جاسکتا ہے کہ ایک طرف الحاد وتشکیک پورے طمطراق کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے چنانچہ عالمی اداروں کی رپورٹ ہے کہ اس وقت الحاد کے اضافے کی شرح اسلام کو چھوڑ کر دیگر مذاہب کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے، یعنی ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس وقت مذہب اسلام کا مقابلہ اگر کسی فتنے سے ہیں تو وہ بلا شبہ الحاد کے نظریات سے ہے، تو دوسری طرف اس زہر کا تریاق جہاں موجود ہے اس سے مکمل طور پر آنکھیں موند لی گئی ہے، حضرت نانوتوی رح نے اسلامی عناوین پر بے شمار کتابیں تحریر فرمائی ہیں جو اگر ایک طرف اپنے معروضات ومشمولات کے اعتبار سے عجائبات کا ایک سمندر ہے تو دوسری طرف حسن ترتیب وحسن وبیاں میں بھی ایک شاہکار کی حیثیت رکھتی ہیں، یہ کتابیں علوم ومعارف کے اس مجموعے کا نام ہے جو ہر علم دوست کی حاجت وضرورت ہیں، لیکن نسل جدید کے لئے ان کتابوں سے استفادہ تو بہت دور ان کے نام سے آشنا ہوجانا بھی حضرت نانوتوی رح پر احسان عظیم سے کم نہیں ہے، حضرت نانوتویؒ کی کتابوں سے ہماری غفلت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ آپ کی شہرہ آفاق تصنیف" تحذیر الناس" پر اعتراض واشکال کا ایک کوہ ہمالہ کھڑا کردیا گیا، حضرت فاضل بریلوی رح سے لیکر ان کے خوشہ چینوں، اور عقیدت مندوں تک نے پچاسوں اعتراض کے پلندے تیار کردئے، لیکن ہم نے کبھی ان اعتراضوں کا سنجیدگی سے جواب دینے کی

کوشش ہی نہیں کی ، اور اس سے بڑھ کر تکلیف دہ بات یہ ہے کہ ان تمام اعتراضوں کے جوابات خود حضرت نانوتویؒ کی تحریروں میں موجود ہیں مثلاً "تحذیر الناس" کے زمانۂ تالیف ہی میں آپؒ نے "تنویر النبراس" نامی رسالہ تحریر فرمایا تھا، جو "تحذیر" پر اٹھنے والے ہر ممکنہ اعتراض کا کافی و شافی جواب تھا، چنانچہ بعد کے ادوار میں شارح بخاری مولانا شریف الحق امجدی صاحب، غزالیٔ دوراں مولانا سعید کاظمی صاحب علیہما الرحمہ اور دیگر اکابرین بریلی نے اپنے اپنے مقالوں میں وہی اعتراض و اشکال پیش فرمائیں جس کے جواب سے حضرت نانوتویؒ ایک عرصہ پہلے ہی فارغ ہو چکے تھے، لیکن ہمارے پاس ان مقالوں کا کوئی جواب نہیں تھا--- خاکسار کی دانست کے مطابق ---کیونکہ تنویر النبراس اپنی تالیف کے ڈیڑھ صدی بعد زیور طبع سے آراستہ ہو سکی، اس کا صاف مطلب نکلا کہ ہم نے حضرت نانوتوی کی کتابوں پر وہ توجہ نہیں دی جس کی وہ حق دار تھیں۔

جہانِ ادب

شاعر: سرفراز بزمی

غزل

جب سے ہیں اس شہر میں گمنام سے — "کٹ رہی ہے زندگی آرام سے
دیکھ لی دریا تری دریا دلی — ہم لب ساحل بھی تشنہ کام سے
جس کو پاکر آپ کا در چھوٹ جائے — معذرت ! اس عزت و اکرام سے
آفتیں آئیں تو آنے دیجئے — چین ملتا ہے تمہارے نام سے
پھول کو مرجھا کے مرتا دیکھ کر — ڈر رہا ہوں حسن کے انجام سے
ما بدولت کو کہاں فرصت نصیب محو — راحت مفلسی آرام سے
اک دروغ مصلحت آمیز تھا — منھ چھپانا عشق کے الزام سے
پونچھ کر خوش ھے گنہگار حرم — اشک اپنے جامہ احرام سے
پوچھتا ھے قسمت بزمی کا راز — اک ستارہ چرخ نیلی فام سے

تبصرہ برکلام: سرفراز بزمی صاحب
شرف الدین عظیم قاسمی الاعظمی

شوشل میڈیا پر غزلیات کی بھیڑ میں کبھی کبھی ایسے کلام نظروں میں آجاتے ہیں جو اپنی اثر آفرینی، فنی حسن و جمال کے باعث لوح قلب پر خوشگوار اثرات چھوڑ جاتے ہیں۔انہیں غزلوں میں سے سرفراز بزمی صاحب کی یہ غزل بھی ہے جو ادارہ ادب اسلامی حیدرآباد کے زیر اہتمام طرحی مشاعرہ کے موقع پر لکھی گئی ہے، سرفراز صاحب کے کلام ہائے زریں سے ایک

عرصہ سے بصارت آشنا ہے، اور ذہن ودل ان سے محظوظ بھی ہور ہے ہیں، وہ ایک قادر الکلام اور زود گو شاعر ہیں، ان کی سخنوری غزل کی تمام خوبیوں اور جمالیاتی سے مرصع ہوتی ہے، مضامین کی ندرت، معانی کی گہرائی، اور اثر انگیزی سے جہاں ان کے تخیل کی عظمت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے وہیں فنی چابکدستی، لفظوں کے دروبست پر ان کی قدرت، ان کے استعمال اور اسلوب وآہنگ کی جدت سے ان کی فنی بلندی بھی نمایاں طور محسوس ہوتی ہے۔ زیرنظر غزل اس مصرع طرح پر کہی گئی ہے،، کٹ رہی ہے زندگی آرام سے،، جس پر انھوں نے مطلع میں ہی گرہ لگادی ہے، اور اس خوبی سے استعمال کیا ہے کہ کہیں سے محسوس نہیں ہوتا ہے کہ مطلع تضمین کا ہے، دیکھئے یہ مطلع:

جب سے ہیں اس شہر میں گمنام سے
کٹ رہی ہے زندگی آرام سے

غزل کا دوسرا شعر اس طرح ہے:

دیکھ لی دریا تری دریا دلی
ہم لب ساحل بھی تشنہ کام سے

بہت خوبصورت شعر ہوا ہے اور دریا کی ظاہری دریا دلی کے حوالے سے کس قدر لطیف ساقی میخانے پر طنز کیا ہے، اور اس کنائے سے اس کی بخالت کو آشکارا کیا ہے، مضمون میں جدت بھی ہے، اثر آفرینی بھی۔ رنگ تغزل کے حوالے سے حسن وعشق کی داستان طرازی بالکل عام ہے، وفا پرستی کی حکایتیں اور در عاشق سے ہجر وفراق کی روداد اکثر سامنے آتی رہتی ہے، لیکن یہی مضمون جب بزمی صاحب کے تخیل میں آیا تو کس خوبصورتی سے لفظوں کے پیراہن میں ظاہر ہوا ملاحظہ کے قابل ہے:

جس کو پا کر آپ کا در چھوٹ جائے
معذرت اس عزت واکرام سے

غزل کا یہ شعر بھی نہایت خوبصورت ہے، جس میں شاعر نے محبوب کے مقابلے میں دنیا کی ساری مصیبتوں کو گرد راہ قرار دیا ہے، اور اس کے نام کے وظیفے کو باعث چین وسکون شمار کیا ہے اس شعر میں رنگ غزل مکمل شباب پر نظر آتا ہے:

آفتیں آئیں تو آنے دیجیے
چین ملتا ہے تمہارے نام سے

غزل کا یہ شعر بھی قیامت کا ہے، اور عبدیت کا مضمون بڑے سلیقے سے اس میں سمٹ آیا ہے:

پونچھ کر خوش ہے گنہگار حرم
اشک اپنے جامہ احرام سے

مختصر سی بحر کا یہ شعر اپنے اندر مضامین کا سمندر سمیٹے ہوئے ہے، انسانی فطرت اور اس کے نیچر کی بڑے واضح طور پر اس شعر نے ترجمانی کی ہے:

پوچھتا ہے قسمت بزمی کا راز
اک ستارہ چرخ نیلی فام سے

مقطع کا شعر بھی بہت عمدہ ہے، اور بڑے خوبصورت انداز میں انھوں نے تقدیر کی حقیقت اور اس کی اہمیت کی ستاروں کے حوالے سے ظاہر کی ہے۔ بزمی صاحب کی پوری غزل ان کی شاعرانہ عظمت، فکر کی گہرائی اور فن کی دسترس اور لفظوں کو شاعری کے سانچے میں ڈھالنے کے ہنر سے روشناس کراتی ہے، ہر شعر سلاست وروانی اور برجستگی ورعنائی کا شاندار نمونہ ہے۔

تبصرہ کتب

مفتی شرف الدین الاعظمی

نام کتاب۔نمونے کی زندگی

مصنف۔مولانا ضیاء الدین قاسمی ندوی

صفحات۔192 قیمت۔150 روپئے

ناشر۔دارالعلوم تحفیظ القرآن سکٹھی مبارکپور اعظم گڈھ

زبان نبوت سے نکلے ہوئے قیمتی جواہر پارے اور لعل و گہر کی تشریح وتوضیح زندگی کا نہایت قابل فخر اور گراں قدر کارنامہ ہے، یہ وہ سعادت مندی اور فیروزمندی ہے جس کی وجہ سے دنیا میں بھی عظمت ورفعت کی سوغات حاصل ہوتی ہے اور آخرت بھی روشن اور تابناک ہوجاتی ہے۔رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات وفرامین کی حفاظت وصیانت اور ان کی تشریحات کے حوالے سے اساطین امت مسلمہ کی جدوجہد،محنت وریاضت،سرگرمی وجانفشانی اور بے مثال انہماک واشتغالوہ امتیاز ہے جس کی ہمسری تو کیا ادنی سی مثال بھی دنیا کی دوسری قومیں پیش کرنے سے قاصر ہیں۔

بعثت نبوی کو چودہ صدیاں گذریں، زندگی کے ہر شعبے میں انقلابات رونما ہوئے، طرز حیات بدلے، افکار ونظریات کی سمت تبدیل ہوئی، زاویئے بدلے، اقصائے عالم انسانی چیرہ دستیوں سے لالہ زار ہوا، ظلم وجبر کے طوفانوں نے سفر حیات کے تمام راستوں کو مسدود کیا، مادہ پرستی کی تیز ہواؤں نے اخلاق وکردار کے چراغوں پر حملے کئے، لیکن کربناک ماحول، انسانیت سوز رویوں اور حوصلہ شکن حالات میں بھی ہر زمانے میں ایک قافلہ عشق ووفا ایسا بھی تھا، جس نے

وقت کے تمام طوفانوں میں زندگی کے تمام سرمائے کو قربان کر کے تعلیمات نبوی کے چراغوں کو روشن رکھا، آتش و آہن کی فضاؤں میں ہر دور میں عشق و مستی کے مئے طہور سے مخمور ایک کارواں تھا جس نے احادیث رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تحقیق و دریافت اور تشریحات توضیحات کا جہاں آباد کر کے انسانیت کو سمت سفر دی، ارتقاء کی راہوں سے آشنا کیا، اور زندگی کے حقیقی مقاصد سے روشناس کرایا۔

یہ کتاب نمونے کی زندگی مذکورہ کاروان علم و تحقیق کے تاریخ ساز کارناموں کی ایک سنہری کڑی ہے، جو نخلستان فکر و فن، میں مولانا ضیاء الدین قاسمی ندوی استاذ مدرسہ دار العلوم تحفیظ القرآن کے زرنگار قلم سے وجود میں آئی ہے، کتاب کے مشمولات کو دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ مصنف علام کی ذات جہاں علوم و فنون کے بحر بیکراں پر وسیع اور گہری نظر رکھتی ہے، وہیں اس کا تعلق زندگی اور اس کے اردگرد کی کائنات سے بھی بہت مضبوط ہے، اور معاشرے وسماج کے متضاد کردار اور اس کے نتائج سے بھی وہ پوری طرح سے باخبر ہے۔ اس زر پرست عہد میں جہاں رشتے ناطے اور تعلقات کے پیمانے مادی اثاثوں میں محصور ہو چکے ہوں، اخلاقی عمارتیں مخدوش اور شجر ہائے اخلاص و وفا زرد زرد ہو چکے ہوں، آفاقی پیغام اور اسلامی تعلیمات کی تشریحات کی اہمیت دوچند ہو جاتی ہے، فکر ارجمند سے مزین مولانا ندوی صاحب کے قلب نے اس تقاضے کو محسوس کیا اور اہل شوق ہی نہیں بلکہ عام افراد کی تہذیب و اصلاح کی غرض سے ان ارشادات و فرامین رسول اکرم صلی اللہ علیہ کا انتخاب کیا جو انسانی کمالات، اور ملکوتی صفات کو اجاگر کر کے کامیابی کی شاہراہ ہموار کرتے ہیں اور حیوانی صفات و کردار کی نشاندھی کر کے کاروان ہستی کو ان سے محفوظ رکھتے ہیں۔

مولانا ضیاء الدین قاسمی ندوی صاحب بہترین معلم و بافیض مدرس اور متبحر عالم دین کے

ساتھ ساتھ زبردست ادیب وانشاء پرداز بھی ہیں، افکار وتخیلات اور احساسات کے اظہار کی ان کے اندر بلا کی قوت ہے، وہ اردو عربی دونوں زبانوں پر زبردست قدرت رکھتے ہیں، ان کا ذہن تخلیقی صلاحیتوں سے معمور ہے، وہ مصنف بھی ہیں اور مصنف گر بھی، وہ صحافی بھی ہیں اور صحافی ساز بھی، دلوں میں عظمتوں کے نقوش ثبت کرنے والے خوبصورت نثر نگار بھی ہیں اور جہان فکر وفن کو وسعتوں سے ہم کنار کرنے والے فکری وادبی تخلیق کار بھی، ان کے تخلیقی سفر کا دورانیہ تقریباً چالیس سال پر محیط ہے جس میں ان کی ادیبانہ، عالمانہ، محققانہ اور مبصرانہ تحریروں کے بے شمار جلوے ملک کے مؤقر علمی ادبی، تحقیقی اور اصلاحی رسائل وجرائد میں بکھرے ہوئے ہیں۔

زیر نظر کتاب ان جلوؤں کا ایک عکس ہے جس میں انھوں نے مختلف موضوعات ومضامین پر مشتمل تیس احادیث کو منتخب کیا ہے، جن کا تعلق ظاہری کردار سے بھی ہے اور باطنی نظریات سے بھی، اخوت و بھائی چارگی سے بھی ہے اور اختلافات کی صورت میں اعتدال و توازن کے سسٹم سے بھی، انفرادی زندگی سے بھی ہے اور اجتماعی حیات سے بھی، عبادت وریاضت سے بھی ہے اور معاملات ومعاشرت سے بھی، بطور مثال چند عنوانات نذر قارئین ہیں، غصہ کی زیادتی ہلاکت خیز صفت ہے، اسلام میں رفق مہربانی کی اہمیت، دجال سے زیادہ خطرناک چیز ریا ونمود، صابرین وشاکرین کے مراتب و درجات، کلید کامیابی اتباع سنت واتحاد ملت، مسلمان اپنے بھائی کا خیر خواہ ہوتا ہے، مومن کی ایثار پسندی اور نفع رسانی کی برکتیں۔

زبان وبیان کے لحاظ سے بھی یہ کتاب ادب کی فنی خوبیوں سے آراستہ ہے مولانا ندوی بہت شگفتہ اور خوبصورت قلم کے مالک ہیں، اردو زبان وادب اور اس کی فنی باریکیوں پر ان کی نظر بہت وسیع ہے، سادگی کے ساتھ پرکاری، برجستگی کے ساتھ رعنائی، اور لفظوں کے دروبست کے ساتھ سلاست روانی ان کی تحریروں کا امتیاز ہے، ادبی تحریروں کی یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ مطالعہ

کا مسافر جب اس میں اپنا سفر شروع کرتا تو اس کے جمال میں اس طرح محو ہو جاتا کہ پھر کوئی بھی چیز اس کے سفر کو روک نہیں سکتی ہے یہاں تک کہ منزل اس کے قدموں کے نیچے آ جائے مولانا کی تحریروں میں بھی یہی کیفیت پائی جاتی ہے ذیل کے اس مختصر سے اقتباس سے ان کے ادبی شعور کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

> ریا کاری بہت عظیم فتنہ ہے اس سے لوگوں کو اللہ کے نام پر دھوکہ دے کر اپنا مقصد حاصل حاصل کرنا اور اپنی عزت بنانا ہے بظاہر اعمال ایسے ہیں کہ لوگ متاثر ہوں اور ہوتے ہیں، کتنے دین دار پرہیزگار، عبادت گذار اس مرض میں کسی نہ کسی طرح مبتلا ہیں، تلبیس ابلیس کا شکار ہیں، ایک مالدار دین کے راستے میں اپنی دولت لٹاتا ہے، اور ایسی ترکیبیں اختیار کرتا ہے کہ اس کی شہرت ہو، حج کے لئے سفر کرتا ہے، مگر ریا ونمائش کے تمام اسباب کرنا ضروری سمجھتا ہے، صدقات وخیرات کا اہتمام کرتا ہے اور کسی نہ کسی عنوان سے تشہیر کرتا ہے تاکہ لوگ تعریف کریں، اور جب تعریفیں کی جاتی ہیں تو پھر ریا کاری کا لبادہ اوڑھ لیتا ہے اور کہتا ہے بھائی! بس اللہ کا فضل ہے میں کیا ہوں، اگر اس کی شاہ خرچی، تقوی کا لوگ تذکرہ نہ کریں تو کبیدہ خاطر ہوتا ہے (صفحہ:52)

حاصل یہ کہ ان تمام اوصاف وکمالات جو ایثار وہمدردی، اخوت ومحبت، تواضع و انکساری، اطاعت وفرمانبرداری، تقویٰ و طہارت، اخلاص وللّٰہیت، اعتدال پسندی ومیانہ روی، تحمل وبردباری، اتحاد واتفاق، صبر ورضا اور تشکر وامتنان کی صورت میں اعلیٰ کردار کا حصہ ہیں، کا احاطہ کرتی ہے جو انسانی زندگی کو دنیا وآخرت دونوں جہانوں میں سرخروئی کا ذریعہ ہیں اور ان تمام پست کرداروں جو خودغرضی ومفاد پرستی، زر پرستی وانا پرستی، کبر نخوت، خودفریبی وخود پسندی، ظلم وتشدد، نمائش وریا کاری، فحش کلامی وبدزبانی، کی شکل میں فرد اور معاشرے کو اخلاقی

پستی معاشی بدحالی، سیاسی ابتری اور خداوندعالم سے بغاوت وانحراف اور ظلم وزیادتی کے خوفناک اندھیروں میں لے جانے والے ہیں ان پر تفصیلی روشنی ڈالتی ہے۔

باطنی خوبیوں کی طرح ظاہری حسن سے بھی یہ کتاب آراستہ ہے، سرورق جدید طباعت کے مطابق دیدہ زیب ہے کاغذ بھی نفیس اور معیاری استعمال کیا گیا ہے، اپنے موضوع مواد، اسلوب کی دلکشی کے اعتبار سے یہ کتاب اس لائق ہے کہ نہ صرف اسے میز اور الماریوں کی زینت بنایا جائے بلکہ اس کا مطالعہ کر کے دل ودماغ کو روشن کیا جائے، ایک بار تھوڑا سا وقت آپ بھی اس کی نذر کریں انتہائی گراں مایہ سرمایۂ حیات سے آپ کے جیب وداماں کو یہ کتاب بھر دے گی۔

خوشخبری

ادارہ" الماس" یہ مژدۂ جانفزاں سناتے ہوئے خوشی محسوس کرر ہا ہے کہ" ماہنامہ الماس" کے اگست کا شمارہ محدث عصر حضرت مولانا حبیب الرحمن الاعظمی استاذ دارالعلوم دیوبند سے منسوب" مولانا حبیب الرحمن الاعظمی نمبر" ہوگا، جس میں اپ کی ہشت پہلو شخصیت کی نمایاں خصوصیات کو اجاگر کرنے کی کوشش کی جائے ،خصوصا" دارالعلوم دیوبند میں آپ کی تدریس وتعلیم ، ماہنامہ دارالعلوم دیوبند میں آپ کی اداریہ نویسی ،قلم وقرطاس سے حوالے سے آپ خدمات، دشت تحقیق میں آپ کی آبلہ پائی ، جمعیۃ علماء ہند کے پلیٹ فارم سے آپ کی سیاسی بصیرت ،فن اسماء الرجال پر اپ کی دسترس ، اور معاصرین میں اپ کا مقام ومرتبہ" جیسے موضوعات شمارے کے اہم عناوین ہونگے ادارے نے نمبر کو وقیع اور اہم بنانے کے لئے ملک کے نامور علماء وچوٹی کے قلم کاروں کی خدمات حاصل کی ہیں ، باری تعالی سے دعا ہے کہ ہماری نخل تمنا امیدوں کے گل وغنچوں سے لہلہا اٹھے۔ آمین یارب العالمین

نوٹ: ماہنامہ الماس کے حالیہ تمام شمارے برقی ہونگے ، البتہ اہل علم کی خدمت میں مولانا حبیب الرحمن نمبر مطبوعہ شکل میں پیش کیا جائے گا۔ انشاء اللہ